جنوری ۲۰۰۵ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

عرض احوال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حکومت پاکستان نے حال ہی میں نئے کمپیوٹرائزڈ پاسپورٹوں کے اجراء کا فیصلہ کیا ہے جس پر عملدرآمد کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہ پاسپورٹ جدید عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ڈیزائن کئے گئے ہیں۔ ان میں یہ سہولت رکھی گئی ہے کہ ایئرپورٹ کے امیگریشن کاؤنٹر میں موجود مشین میں سے اگر ایسے پاسپورٹ کو گزارا جائے تو وہ مشین پاسپورٹ میں درج شدہ مواد (Data) کو خود پڑھ کر پرنٹ کر دیتی ہے اور یوں مسافروں اور متعلقہ عملے کا بہت سا وقت بچ جاتا ہے —— یہاں تو معاملہ بہت سیدھا اور معقول نظر آتا ہے۔ لیکن ان نئے پاسپورٹوں کی آڑ میں حکومت پاکستان نے نہایت غیر محسوس طریقے پر دشمنانِ اسلام کے مذموم عزائم کی تکمیل کی خاطر نئے پاسپورٹوں سے مذہب کے خانے کو حذف کر دیا۔ جو گزشتہ 25 سال سے پاکستانی پاسپورٹ کا لازمی حصہ تھا۔ اور جب ''مجلس تحفظ ختم نبوت'' کے کچھ درویش منش لیکن نہایت چوکنے کارکنوں نے اس غیر محسوس تبدیلی کا نوٹس لیتے ہوئے صدائے احتجاج بلند کی تو حکومتی حلقے سے یہ عذر لنگ تراشا گیا کہ نئے کمپیوٹرائزڈ پاسپورٹ میں مذہب کے خانہ کی گنجائش ہی موجود نہیں ہے۔ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے!!

گزشتہ ہفتے اسلام آباد میں منعقد ہونے والی آل پارٹیز تحفظ ختم نبوت کانفرنس میں جس کی میزبانی کا شرف جمعیت علمائے اسلام کے سربراہ مولانا فضل الرحمٰن کو حاصل ہوا' پاسپورٹ میں اس تبدیلی کے حوالے سے حکومت کی جانب سے پیش کئے جانے والے تمام عذرات لنگ کی دلائل و براہین کے ذریعے قلعی کھولی گئی اور حقائق و شواہد کی روشنی میں اس امر کو پایۂ ثبوت تک پہنچایا گیا کہ حکومت کا فیصلہ قطعی طور پر بلا جواز ہے اور یہ دراصل عالمی اسلام دشمن طاقتوں یعنی امریکہ و اسرائیل کے مذموم ایجنڈا کی تکمیل میں معاون بننے کے مترادف ہے جو قادیانیوں کے ذریعے سرزمین حرم کو اپنی سازشوں کا مرکز و محور بنانے پر تلے

ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس کانفرنس میں شریک تمام دینی وسیاسی جماعتوں نے متفقہ طور پر حکومت کے اس فیصلے کو رد کرتے ہوئے اس عزم کا اظہار کیا کہ حکومت نے اس ناروا قدم کو روکنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔

اس بھرپور کانفرنس کے روح رواں آل پاکستان مجلس تحفظ ختم نبوت کے سرپرست اعلیٰ حضرت مولانا خواجہ خان محمد صاحب تھے جو اپنی پیرانہ سالی اور شدید ضعف کے باوجود پورا وقت شریک اجلاس رہے۔ گو انہوں نے زبان سے کچھ نہ کہا لیکن ان کا وجود ہمہ تن گفتگو تھا' کانفرنس کے شرکاء کے جذبات کی گرمی انہی کے نفس گرم کی مرہونِ منت تھی۔

بلاشبہ یہ ایک بھرپور پریس کانفرنس تھی اور ایک مسلمان معاشرے میں دینی جماعتوں اور علماء کے اصل اور مطلوب کردار کی آئینہ دار تھی۔ کاش کہ یہ دینی جماعتیں اور علماء کرام ملک میں امڈتے ہوئے منکرات کے سیلاب کو روکنے اور ملکی سطح پر نفاذِ شریعت کے لئے بھی اسی طرح مل جل کر لائحہ عمل بنائیں اور احتجاجی ومظاہراتی سیاست کو اپنا کر اپنے رول کو بہتر طور پر ادا کرنے کا عزم کریں۔

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد!

تذکرہ و تبصرہ

قضیۂ فلسطین

تاریخی پس منظر اور ہولناک مستقبل

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

کا مسجد دار السلام باغ جناح لاہور میں

۱۶/اپریل ۲۰۰۴ء کا خطاب جمعہ

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امّا بَعد:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ
الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ﴿۱﴾﴾

(بنی اسراء یل)

﴿وَ اِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِہٖ یٰقَوۡمِ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ اِذۡ جَعَلَ فِیۡکُمۡ
اَنۡۢبِیَآءَ وَ جَعَلَکُمۡ مُّلُوۡکًا ٭ۖ وَّ اٰتٰىکُمۡ مَّا لَمۡ یُؤۡتِ اَحَدًا مِّنَ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۲۰﴾ یٰقَوۡمِ
ادۡخُلُوا الۡاَرۡضَ الۡمُقَدَّسَۃَ الَّتِیۡ کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمۡ وَ لَا تَرۡتَدُّوۡا عَلٰۤی اَدۡبَارِکُمۡ
فَتَنۡقَلِبُوۡا خٰسِرِیۡنَ ﴿۲۱﴾ الی قولہ تعالی: قَالُوۡا یٰمُوۡسٰۤی اِنَّا لَنۡ نَّدۡخُلَہَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوۡا
فِیۡہَا فَاذۡہَبۡ اَنۡتَ وَ رَبُّکَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا ہٰہُنَا قٰعِدُوۡنَ ﴿۲۴﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ لَاۤ
اَمۡلِکُ اِلَّا نَفۡسِیۡ وَ اَخِیۡ فَافۡرُقۡ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ فَاِنَّہَا
مُحَرَّمَۃٌ عَلَیۡہِمۡ اَرۡبَعِیۡنَ سَنَۃً ۚ یَتِیۡہُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ؕ فَلَا تَاۡسَ عَلَی الۡقَوۡمِ
الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۲۶﴾﴾ (المائدۃ) صدق اللّٰہ العظیم

مجھے جس موضوع پر آج گفتگو کرنی ہے' یہ موضوع میرے لئے نیا نہیں ہے۔ اس پر میں تقریباً پچیس سال سے گفتگو کر رہا ہوں۔ سب سے پہلے میں نے ۸۰۔۱۹۷۹ء میں اس موضوع پر گفتگو کی۔ ۱۹۸۰ء میں کینیڈا اور امریکہ کے مابین واقع نیاگرا کے مقام پر اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن آف نارتھ امریکہ کے اجلاس میں مَیں نے اسی موضوع پر تقریر کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ایران میں تازہ انقلاب آیا تھا اور اس کا ایک بڑا غلغلہ اور زور و شور تھا۔ یہاں تک کہ ''Times'' اور ''News Week'' جیسے کثیر الاشاعت ہفت روزہ جرائد نے اس پر خاص نمبرز شائع کئے تھے۔ نیوز ویک کا ٹائٹل تھا: ''The Millitant Islam on the march'' یعنی اب عسکری اسلام آگے بڑھنا شروع ہو گیا ہے۔ گویا کہ دنیا کانپ رہی تھی کہ دنیا کے ایک ملک میں اتنا زبردست انقلاب آ گیا۔ دوسری طرف افغانستان میں روسیوں کے خلاف جہاد زوروں پر تھا' جس میں افغان اپنی سرفروشی' بہادری اور جاں فشانی کے تاریخ میں نئے باب رقم کر رہے تھے۔ دنیائے اسلام میں عام طور پر یہ خیال تھا کہ اب بس غلبۂ اسلام کا دَور شروع ہو رہا ہے۔

میں نے اُس وقت اس پس منظر میں عرض کیا تھا کہ مسلمانوں کا یہ موجودہ اُبھار اور اُبال ہانڈی کے اُبال کی طرح بہت عارضی ہے' ابھی اُمت مسلمہ پر بڑے سخت دور آنے والے ہیں اور اسے بڑی بڑی سزائیں ملنے والی ہیں' البتہ اس کے بعد پھر یقیناً ایک دور آنے والا ہے کہ پوری دنیا پر اسلام کا غلبہ ہوگا۔ اس کے بعد میں نے ۱۹۹۲ء میں مضامین لکھے جو نوائے وقت میں چھپتے رہے اور پھر ۱۹۹۳ء میں ''سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتوں کا ماضی' حال اور مستقبل'' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ سابقہ اُمت مسلمہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم یعنی بنی اسرائیل تھی جسے اللہ تعالیٰ نے کتابِ ہدایت اور میزانِ شریعت دی اور وہ قوم دو ہزار برس تک اس منصب پر فائز رہی کہ وہ دنیا میں اللہ کی نمائندہ تھی۔ انہیں چودہ سو قبل مسیح یعنی آج سے تقریباً ساڑھے تین ہزار سال قبل تورات عطا کی گئی۔ اُس وقت وہ اُمت مسلمہ تھے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ

کی ولادت مبارکہ ۵۷۱ء میں ہوئی اور آپؐ پر وحی کا آغاز ۶۱۰ء میں ہوا۔ آپؐ کی بعثت کے چودہ سال بعد ۶۲۴ء میں تحویل قبلہ کا حکم آیا کہ ﴿فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ یعنی اب نماز میں رُخ بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ کی طرف کر لو! یہ حکم اس بات کی واضح علامت تھا کہ سابقہ اُمت مسلمہ جس کا مرکز یروشلم (بیت المقدس) تھا' وہ اپنی اس حیثیت سے معزول کر دی گئی ہے' اور جو نئی اُمت اس منصب پر فائز کی گئی ہے وہ اُمت محمد ﷺ ہے' جس کا مرکز خانہ کعبہ ہے۔ اس حوالے سے حضور ﷺ کی بعثت تک بنی اسرائیل کی دو ہزار سالہ تاریخ تھی' جبکہ حضور ﷺ کی بعثت کے بعد سے تقریباً ساڑھے چودہ سو برس اس اُمت محمدؐ کے گزر چکے ہیں۔

ارضِ فلسطین تاریخ کے آئینے میں

فلسطین کے بارے میں مَیں نے ایک بڑا پیارا جملہ ''نیوز ویک'' میں پڑھا تھا: "Too small a geography but too big a history" تو فلسطین جغرافیہ کے اعتبار سے بہت چھوٹی جگہ ہے۔ جب تک مغربی کنارے پر یہودیوں کا قبضہ نہیں ہوا تھا اُس وقت تک اسرائیلی ریاست ایک خنجر کی مانند تھی جو عالمِ عرب کے سینے میں پیوست ہے۔ اس کا رقبہ ہماری سابقہ ریاست بہاول پور کے برابر ہے۔ لیکن اس کی تاریخ پانچ ہزار سال تک پہنچی ہوئی ہے۔ اس کے مانند دنیا کے کسی علاقے کی تاریخ محفوظ نہیں ہے۔ اس کی تاریخ کا آغاز انبیاء کرام علیہم السلام کے سلسلے سے ہوتا ہے۔ آج سے چار ہزار سال قبل' یعنی دو ہزار قبل مسیح میں حضرت ابراہیم علیہ السلام ہجرت کر کے فلسطین میں آئے' جو اِمامُ الناس اور خلیل اللہ ہیں۔ آپؑ عراق کے جنوبی حصے اُر میں پیدا ہوئے تھے جو خلیج فارس کے بہت قریب واقع تھا' اور سلطنت کلدانیہ کا صدر مقام تھا' جہاں کے بادشاہوں کو نمرود کہتے تھے۔ آپ علیہ السلام کی تمام زندگی امتحانات اور آزمائشوں میں گزری اور اِس اعتبار سے آخری امتحان یہ تھا کہ آگ میں ڈال دیئے گئے۔ اس کے کافی عرصے بعد اللہ کی طرف سے آپ علیہ السلام کا بہت بڑا امتحان لیا گیا جب جوان بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ لیکن دشمنوں کی طرف

سے آپؑ کی زندگی کا سب سے بڑا امتحان یہ تھا کہ آپ کو آگ میں ڈال دیا گیا۔ اللہ نے آگ کو حکم دیا تو وہ گل وگلزار بن گئی۔

اس کے بعد آپ علیہ السلام نے وہاں سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ اللہ کا قانون رہا ہے کہ جب کسی قوم کی طرف کوئی رسول بھیجا جائے اور وہ قوم اس کی جان لینے پر آمادہ ہو جائے تو پھر اسے ہجرت کی اجازت ہو جاتی ہے۔ حضور ﷺ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا تھا۔ جب قریش کے سرداروں نے دارالندوہ میں بیٹھ کر آپ ﷺ کے قتل کا فیصلہ کر لیا تب آپ ﷺ کے لئے ہجرت کی اجازت آ گئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق سے ہجرت کر کے فلسطین چلے گئے۔ عراق اور فلسطین کے درمیان چونکہ بہت بڑا ناقابل عبور صحرا ہے (جو اَب صحرائے اردن کہلاتا ہے) لہٰذا آپؑ پہلے جنوبی عراق سے چل کر سیدھے شمالی عراق گئے اور پھر وہاں سے مغرب کو ہو کر فلسطین میں اترے اور یہاں انہوں نے اپنا مسکن اور مرکز بنا لیا۔ اگرچہ بڑے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو آپ نے حجاز میں بیت اللہ کے قریب آباد کیا لیکن حضرت ابراہیمؑ کا اپنا قیام یہیں فلسطین میں رہا۔ پھر اُن کے بیٹے حضرت اسحاق اور پھر اُن کے بیٹے یعنی حضرت ابراہیم کے پوتے حضرت یعقوب (علیہم السلام) کا مقام بھی یہیں رہا۔ ان تین انبیاء کے وہاں تسلسل کے ساتھ قیام کو بھی بنی اسرائیل اپنی تاریخ کا حصہ سمجھتے ہیں۔ ''اسرائیل'' حضرت یعقوبؑ کا لقب تھا اور ''بنی اسرائیل'' کا اطلاق آپؑ کے بارہ بیٹوں اور ان کی آئندہ نسلوں پر ہوتا ہے۔ عبرانی میں اسرائیل کا مطلب ہے عبداللہ (اللہ کا بندہ)۔ بہرحال اُس وقت تک بنی اسرائیل کا ایک قوم کی حیثیت سے کوئی تصور موجود نہیں تھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل مصر چلے گئے اور چار پانچ سو سال وہاں رہے۔ اس دوران ان کا فلسطین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہا۔ لہٰذا بنی اسرائیل کی تاریخ کے ساتھ اُن صدیوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے وقت بنی اسرائیل شدید ترین غلامی اور تعذیب کی زندگی گزار رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے سے فرعون کی غلامی سے نجات دی۔

پانچ چھ سو سال قبل ستر افراد کا قافلہ جو حضرت یوسف علیہ السلام کی دعوت پر مصر میں داخل ہوا تھا' اب اس کی تعداد بوڑھے' بچے' جوان' عورتیں' مرد سب ملا کر چھ لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ ۱۴۰۰ قبل مسیح میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ سینا پر بلا کر تورات دی گئی۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات ملی اور حضرت موسیٰؑ اپنے چھ لاکھ کے قافلے کو لے کر مصر سے چلے اور فلسطین کی سرحد پر پہنچ گئے۔ وہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو حکم دیا کہ اب جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ اور اس ارضِ مقدس میں داخل ہو جاؤ۔

سورۃ المائدۃ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قوم سے مکالمہ بایں الفاظ نقل ہوا ہے: ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ﴾ ''یاد کرو جبکہ کہا تھا موسیٰ نے اپنی قوم سے'' ﴿یٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ﴾ ''اے میری قوم کے لوگو! اللہ کے انعام و اکرام کو یاد کرو جو تم پر ہوا ہے'' ﴿اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ﴾ ''جبکہ اُس نے تمہارے اندر انبیاء پیدا کئے''۔ یوسف اور موسیٰ علیہما السلام اللہ کے نبی ہیں جو اسرائیل کی نسل سے ہیں۔ ﴿وَّجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا﴾ ''اور تمہارے اندر بادشاہ بھی بنائے''۔ یہ دراصل پیشین گوئی ہے کہ تمہارے اندر طالوت' حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام جیسے بڑے بڑے بادشاہ آئیں گے۔ ﴿وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ''اور تمہیں اللہ نے وہ سب کچھ دیا جو پوری دنیا میں کسی اور قوم کو نہیں دیا''۔ ﴿یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ ''اے میری قوم کے لوگو! سب داخل ہو جاؤ اس ارضِ مقدس میں جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے''۔ اللہ کی طرف سے اللہ کا رسول یہ کہہ رہا ہے کہ یہ تمہارے لئے اللہ کی طرف سے مقدر ہے۔ ﴿وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰۤی اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ﴾ ''(اب دیکھو بزدلی کا مظاہرہ نہ کرنا!) اور اپنی پیٹھوں پر نہ لوٹ جانا مبادا کہ تم خسارے والے ہو جاؤ''۔

لیکن پوری قوم نے اپنے رسولؑ کو کورا جواب دے دیا۔ ﴿قَالُوْا یٰمُوْسٰۤی اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِیْهَا﴾ ''انہوں نے کہا اے موسیٰ! ہم ہرگز ہرگز کبھی بھی اس (ارض فلسطین) میں داخل نہیں ہوں گے جب تک کہ (جو لوگ اس پر قابض ہیں)

وہاں موجود ہیں''۔یعنی اگر وہ وہاں سے نکل جائیں گے تو ہم داخل ہو جائیں گے' جنگ کرنے کو ہم تیار نہیں ہیں۔ ﴿ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴾ ''تو جاؤ تم اور تمہارا ربّ جا کر لڑو' ہم تو یہیں بیٹھے ہیں''۔ ﴿قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَا اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ﴾ ''(اس پر حضرت موسیٰؑ نے اللہ سے) عرض کیا: اے میرے ربّ! (پوری قوم نے جواب دے دیا ہے) مجھے اختیار ہے تو اپنی جان پر اور اپنے بھائی (ہارون) کی جان پر''۔ ﴿فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ﴾ ''پس تُو ہمارے اور ان فاسقوں کے درمیان علیحدگی کر دے''۔ ہم ان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے۔اللہ تعالیٰ نے علیحدگی تو نہیں ہونے دی البتہ یہ فرما دیا کہ یہ بزدلی نہ دکھاتے تو ہم ابھی ان کو فلسطین دے دیتے۔ ﴿ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً ﴾ ''فرمایا (انہوں نے بزدلی دکھائی ہے) تو یہ (ارض مقدس) چالیس برس تک اُن پر حرام کر دی گئی ہے'' ﴿یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ فَلَا تَاْسَ عَلَی الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ﴾ ''اب وہ اسی زمین کے اندر بھٹکتے پھریں گے۔ پس اب تم افسوس نہ کرو اِن فاسقوں کے بارے میں (کہ ان کا یہ حشر ہو رہا ہے)''۔

بنی اسرائیل پر یہ چالیس برس ایسے گزرے کہ اس دوران حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کا انتقال ہو گیا۔ ساری نسل جو کہ مصر میں غلام رہی تھی' ختم ہو چکی تھی۔ اب نئی نوجوان نسل اُبھری جو صحرا میں پیدا ہوئی اور یہیں پلی بڑھی۔ صحرا کی زندگی چونکہ بڑی سخت ہوتی ہے لہٰذا اس سختی کو جھیلنے والی نسلی میں عزم و ہمت اور جوش و ولولہ تھا۔ اس نسل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جانشین حضرت یوشع بن نون کی سرکردگی میں فلسطین پر حملہ کیا اور اریحہ نامی شہر (جو اَب جریکو کہلاتا ہے) فتح کر لیا۔ اسی طرح رفتہ رفتہ پورا فلسطین فتح ہو گیا۔ لیکن فاتح قوم نے ایک بہت بڑی غلطی یہ کی کہ پورے فلسطین پر کوئی ایک حکومت قائم نہیں کی' بلکہ بارہ میں سے دس قبیلوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لیں' جبکہ دو قبیلوں کا پتہ ہی نہیں چلتا کہ کہاں گئے۔ انہیں "The lost tribes of the house of Israel' کہا جاتا ہے۔ ان کا

تاریخ میں کہیں سراغ نہیں ملتا۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ وہ بھارت میں آ کر آباد ہو گئے اور یہاں کا برہمن وہی یہودی طبقہ ہے جو اُس وقت یہاں آیا اور اس نے اپنے آپ کو ''برہما'' یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منسوب کیا۔ ''صحفِ ابراہیم و موسیٰ'' کا قرآن مجید میں دو جگہ ذکر ہے' لیکن وہ آج ہمارے پاس کہیں نہیں ہیں۔ تورات بگڑی تگڑی ہے' لیکن ہے تو سہی' زبور محرّف ہے لیکن ہے تو سہی' انجیل کیسی بھی ہو' وجود تو رکھتی ہے' لیکن آج دنیا میں صحف ابراہیم کے نام سے کوئی کتاب موجود نہیں ہے' میری رائے ہے کہ ہندوؤں کے اپنشد درحقیقت صحفِ ابراہیم کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ میں نے یہ رائے اپنشد کا کچھ مطالعہ کر کے قائم کی ہے۔ واللہ اعلم!

بہرحال انہوں نے دس چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر لیں جو باہم دست و گریبان رہنے لگیں۔ یہاں تک کہ اُن ریاستوں نے وہ طرزِ عمل اختیار کیا جو ہندوستان میں انگریز کی آمد کے وقت بعض مسلم ریاستوں نے اختیار کیا تھا۔ جب انگریز جنوبی ہند پر حملہ آور ہوا تو میسور کے سلطان حیدر علی نے زبردست مزاحمت کی' پھر سلطان ٹیپو اُن کے خلاف ڈٹا رہا۔ اُس وقت چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستیں آپس میں لڑ رہی تھیں اور ٹیپو کے خلاف انگریز کی مدد کر رہی تھیں۔ اسی طرح بنی اسرائیل کی ان ریاستوں کا یہ حشر ہوا کہ آس پاس کی مشرک قومیں ایک دوسرے کے خلاف لڑائی میں ان سے مدد لیتی تھیں۔ ہوتے ہوتے اُن قوموں کا اتنا اثر و نفوذ ہو گیا کہ وہ تقریباً پورے فلسطین پر قابض ہو گئے اور بنی اسرائیل کو اُن کے گھروں سے نکال باہر کیا۔ یہ ان کی تین سو برس کی تاریخ ہے۔ پھر انہیں ہوش آیا کہ ہمیں تو جہاد کرنا چاہئے۔ چنانچہ انہوں نے وقت کے نبی سے کہا کہ ہمارے لئے ایک سپہ سالار معین کر دیں کہ جس کی سربراہی میں ہم اللہ کے راستے میں جنگ کریں۔ انہوں نے اللہ کے حکم سے حضرت طالوت کو سپہ سالار مقرر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت طالوت کو جالوت کے مقابلے میں فتح دی۔ اس جنگ میں حضرت داؤد علیہ السلام نے' جو اُس وقت ایک نوجوان چرواہے تھے' اپنے گوپیے سے غرقِ آہن جالوت کی آنکھ پر ایسا پتھر مارا کہ وہ ہلاک ہو گیا۔

اس فتح سے یہود کی تاریخ کا ایک زرّیں باب شروع ہوا' جیسے ہمارے خلفاء ثلاثہ کا دَور تاریخ اسلام کا زرّیں باب ہے۔ حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کا دور اسلام کی اصل عظمت کا دور ہے۔ اسی طرح وہاں بھی تین حکمرانوں کا دور میرے نزدیک ان کی خلافت راشدہ ہے جو ۱۰۰۰ ق م سے لے کر ۹۰۰ ق م تک تقریباً ۱۰۰ برس پر محیط ہے۔ اس میں پہلے بادشاہ حضرت طالوت تھے' پھر اُن کے داماد حضرت داؤد اور پھر حضرت داؤد کے بیٹے حضرت سلیمان (علیہما السلام) بادشاہ ہوئے۔ اس کے بعد اُن کا دورِ زوال شروع ہو گیا۔ حضرت سلیمانؑ کے بعد یہ سلطنت اُن کے دو بیٹوں کے درمیان دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ شمالی حصہ اسرائیل اور جنوبی حصہ یہودیہ کہلایا۔ شمالی سلطنت کا دارالخلافت سامریہ اور جنوبی کا یروشلم تھا۔ دونوں سلطنتوں کی باہمی آویزش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۷۰۰ قبل مسیح میں آشوریوں نے اسرائیل کی شمالی سلطنت ختم کر دی' صرف چھوٹی سی جنوبی سلطنت یہودیہ باقی رہ گئی' جس میں یروشلم بھی موجود تھا۔ پھر اُن کے ہاں فسق و فجور کا بازار گرم ہوا تو اللہ تعالیٰ نے عراق کے بادشاہ اور اُس وقت کے نمرود نبوقد نضر (بخت نصر) کے ہاتھوں ان پر زبردست عذاب مسلط کیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جو معبد (ہیکل سلیمانی) تعمیر کیا تھا (جو اصل مسجد اقصیٰ تھی) بخت نصر نے اسے اس طرح مسمار کیا کہ کوئی ایک اینٹ بھی سلامت نہیں رہنے دی۔ لاکھوں افراد کو یروشلم میں موقع پر قتل کر دیا گیا' جبکہ چھ لاکھ یہودی مَردوں' عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا کر بابل لے جایا گیا جو اَب سلطنت عراق کا صدر مقام بن چکا تھا۔ ڈیڑھ سو برس تک فلسطین یہودیوں سے خالی رہا۔ اس دور کو وہ اپنا دَورِ اسارت (Era of Captivity) کہتے ہیں۔ اس کے بعد ایران کا بادشاہ سائرس منظر عام پر آیا' جس نے عراق پر حملہ کیا اور نمرود کو شکست دے کر یہودیوں کو واپس فلسطین جانے کی اجازت دے دی۔

فلسطین واپسی کے بعد بنی اسرائیل میں حضرت عزیر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک زبردست تجدیدی و اصلاحی دعوت اٹھی کہ توبہ کرو' اپنی حرام خوریوں اور حرام کاریوں سے باز آ جاؤ! تم نے جو مشرکانہ اوہام اختیار کر لئے ہیں ان کو ترک کر دو اور جن مشرک

عورتوں سے تم نے شادیاں کر رکھی ہیں ان کو چھوڑ دو۔ اس اصلاحی تحریک کے ذریعے بنی اسرائیل کی تطہیر (Purgation) کی گئی اور انہیں مشرکانہ اعمال سے پاک کیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے معبد سلیمانی کو دوبارہ تعمیر کیا۔ اس کو تاریخی اصطلاح میں ''Second Temple'' کہتے ہیں۔

اس کے بعد اُن پر یونانی حملہ آور ہوئے۔ سکندرِ اعظم یہیں سے گزر کر تباہی و بربادی مچاتا ہوا پنجاب تک آیا۔ پھر اس کے سپہ سالار سلیوکس کی اُن پر حکومت رہی۔ کچھ عرصے بعد رومیوں نے یہاں پر حکومت قائم کر لی۔ البتہ انہوں نے براہِ راست قبضہ نہیں کیا بلکہ وہاں پر مقامی بادشاہتیں رہنے دیں۔ جیسے ہندوستان میں انگریز نے آ کر بہت سی ریاستیں رہنے دیں' لیکن یہاں کے نواب اور مہاراجے انگریز کے ماتحت تھے اور اُس کے اشاروں پر کام کرتے تھے۔ اس کے بعد فلسطین میں ایک عظیم مکابی سلطنت قائم ہوئی جو ۱۷۰ ق م سے لے کر ۶۳ ق م تک پورے ۱۰۰ سال قائم رہی اور اس نے بالکل وہی نقشہ دکھا دیا جو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے زمانے کا تھا۔ اس دوران پورے فلسطین پر یہودیوں کا قبضہ رہا۔ پھر اُن کے اندر زوال آیا اور اللہ تعالیٰ نے رومیوں کو اُن پر مسلط کیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام اسی زمانے میں مبعوث کئے گئے۔ یہودیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کا کفر کیا۔ انہیں ۳۳ یا ۳۴ء میں اللہ تعالیٰ نے آسمان پر اٹھا لیا۔

۷۰ عیسوی میں یہودیوں کی پیٹھ پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا دوسرا کوڑا برسا جب ایک رومن جنرل ٹائٹس نے ان پر حملہ کیا اور یروشلم کی دوبارہ اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ Second Temple گرا دیا گیا۔ چنانچہ ۷۰ء سے آج ۲۰۰۴ء تک ۱۹۳۴ برس سے یہودیوں کا ''خانہ کعبہ'' گرا ہوا ہے۔ ٹائٹس نے یروشلم میں ایک دن میں ایک لاکھ ۳۳ ہزار یہودی قتل کئے اور ۶۶ ہزار کو وہ قیدی بنا کر یورپ لے گیا۔ قیدیوں میں سے جوان اور ذرا دراز قد لڑکیاں اُس نے چن کر اپنے لئے رکھ لیں' باقی سب مَرد و زن کو غلاموں کی حیثیت سے فروخت کر دیا گیا۔ اس دور میں وحشی درندوں کی چیر

پھاڑ کا تماشا دیکھنے کے لئے یہودیوں کو استعمال کیا جاتا تھا۔ باقی ماندہ یہودیوں کو فلسطین سے نکلنے کا حکم دے دیا گیا۔ اُس وقت سے ۱۹۱۷ء تک یہودی فلسطین سے بے دخل رہے ہیں۔

فلسطین پر یہود کے دعوے کی حقیقت

اب آپ دیکھ لیجئے کہ فلسطین پر یہودیوں کا قبضہ کتنے عرصے رہا۔ ان کے قبضے کے دوران میں نے گنوا دیئے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ۳۰۰ برس تک ان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں رہیں۔ پھر حضرت طالوت، حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے دورِ حکمرانی میں ۱۰۰ برس تک ان کا مستحکم قبضہ رہا۔ اس کے بعد دو سلطنتیں قائم ہوئیں اور جلدی ہی پہلی سلطنت ختم ہوگئی۔ کچھ عرصے کے بعد ۵۸۷ قبل مسیح میں دوسری بھی ختم ہو گئی۔ پھر ۱۰۰ برس سے زائد حالت اسیری (captivity) میں رہے۔ پھر صرف ۱۰۰ برس کا دور آیا ہے جس کے دوران انہوں نے اپنی ایک عظیم حکومت قائم کی۔ اس کے بعد وہاں سے نکال دیئے گئے اور یروشلم منہدم کر دیا گیا۔ یہ ساری داستان میں نے آپ کو اس لئے بتائی ہے کہ یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ فلسطین کی سرزمین اللہ نے ہمیں دی ہے اور اس پر ہمارا پیدائشی حق ہے۔ آج بدقسمتی سے لبرل مسلمان، یہاں تک کہ بعض ''وسیع النظر'' علماء بھی ان کے اس دعوے کو تسلیم کر رہے ہیں۔ اس کے لئے قرآن کریم کے ان الفاظ کا حوالہ دیا جاتا ہے: ﴿اُدْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ ''داخل ہو جاؤ اس ارضِ مقدس میں جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے''۔ لیکن یہ لکھ دیا جانا اِن معنوں میں تھا کہ اگر جہاد کر کے فتح کر لو گے تو یہ تمہاری ہوگی۔ جب انہوں نے جہاد و قتال نہیں کیا تو یہ وعدہ ختم ہو گیا اور ان سے کہہ دیا گیا: ﴿فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً﴾ ''پس اب یہ چالیس برس تک اُن پر حرام رہے گی''۔ اس کے بعد بہت تھوڑے عرصے تک وہاں ان کا قبضہ رہا۔ دو ہزار سال پہلے ۷۰ء میں ان کو فلسطین سے نکال باہر کیا گیا تھا اور وہاں ان کا داخلہ تک ممنوع تھا۔ یروشلم کا شہر تو بالکل ہی تباہ و برباد کر دیا گیا تھا۔ قریباً ۱۵۰ سال کے بعد رومی بادشاہ ہیڈریان نے اسے

دوبارہ آباد کیا اور اس کا نام ''ایلیاء'' رکھا۔ حضورﷺ کے زمانے میں بھی اس کا نام ''ایلیاء'' تھا ''یروشلم'' نہیں تھا۔ چنانچہ حدیث کے اندر اس کا یہی نام آیا ہے۔ حضورﷺ نے فرمایا: ((یَخْرُجُ مِنْ خُرَاسَانَ رَایَاتُ سُوْدٌ فَلَا یُرَدُّھَا شَیْءٌ حَتّٰی تُنْصَبَ بِاِیْلِیَاءَ)) (ترمذی) یعنی خراسان کے علاقے سے سیاہ علَم لے کر فوجیں چلیں گی' اُن کا رُخ کوئی نہیں موڑ سکے گا یہاں تک کہ ایلیا میں جا کر وہ جھنڈے نصب ہو جائیں گے''۔ بہرحال فلسطین پر یہودیوں کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ دو ہزار سال پہلے یہاں سے نکال دیئے گئے تھے اور اس عرصے کو وہ اپنا دَورِ انتشار (Diaspora) کہتے ہیں۔ پوری دنیا میں اُن سے شدید نفرت کی جاتی تھی۔ عیسائی یورپ کے اندر انہیں ستایا اور مارا جاتا تھا۔ ان کو شہروں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی اور ان کی بستیاں شہروں سے باہر ہوتی تھیں جہاں یہ جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ دِن بھر میں صرف دو گھنٹے کا وقت مقرر تھا کہ ضروریاتِ زندگی کی خرید و فروخت کے لئے آ جا سکتے ہیں۔

فلسطین پر یہودیوں کے دعوے میں عیسائیوں کا بھی ایک بہت بڑا مؤثر حلقہ اُن کا ہمنوا ہے۔ عیسائیوں کو دو فرقوں پروٹسٹنٹس اور کیتھولکس میں تقسیم کرنے والے بھی یہودی تھے' ورنہ اس سے پہلے سب عیسائی کیتھولکس یعنی پوپ کو ماننے والے تھے۔ پوپ کے خلاف بغاوت یہودیوں نے کرائی تھی۔ چنانچہ پروٹسٹنٹس نے پوپ کی اس حیثیت کو چیلنج کر دیا کہ وہ جو حکم دے وہ واجب الاطاعت ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے پاس بائبل موجود ہے' ہم خود اسے پڑھیں گے' خود سمجھیں گے' خود عمل کریں گے' خود قانون بنائیں گے۔ سب سے پہلے اس بغاوت کا ظہور انگلستان میں ہوا اور انگریزوں نے ''چرچ آف انگلینڈ'' کے نام سے اپنا چرچ علیحدہ کر لیا' جو پوپ کے تحت نہیں تھا۔ سب سے پہلا پروٹسٹنٹ ملک بھی برطانیہ تھا اور وہیں پر یہودیوں نے سب سے پہلا بینک ''بینک آف انگلینڈ'' قائم کیا۔ اس سے پہلے دنیا میں کوئی بینک نہیں تھا' کوئی سودی معاملہ نہیں تھا۔ پوپ کے زیرِ اثر کسی بھی علاقے میں سود کی اجازت نہیں تھی۔ بہرحال یہودیوں نے عیسائیوں کو پروٹسٹنٹس اور کیتھولکس میں تقسیم کر دیا' جیسے

انہوں نے ہمیں شیعہ اور سنی میں تقسیم کیا ہے۔ عبداللہ بن سبا ایک بد بخت یہودی تھا جو حضرت عثمان ؓ کے دورِ خلافت میں یمن سے آیا اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر کے اسلام کے خلاف سازشوں میں مصروف ہو گیا۔ اس نے آ کر یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ عثمان کیسے خلیفہ ہو سکتے ہیں' یہ تو بنو اُمیہ میں سے ہیں جب کہ خلافت تو بنو ہاشم کا حق ہے' اس لئے کہ محمد (ﷺ) تو ہاشمی تھے' لہٰذا حضرت ابوبکر بھی غاصب تھے' حضرت عمر بھی غاصب تھے' حضرت عثمان بھی غاصب ہیں (نعوذ باللہ من ذٰلک) اس نے یہ فتنہ اٹھایا اور اُمت کو دو حصوں (شیعانِ علیؓ اور شیعانِ عثمانؓ) میں تقسیم کر دیا۔ اس نے اِن باطل نظریات کا پرچار کیا کہ حضرت علی (ؓ) کی ذات میں خدا نے حلول کیا ہوا ہے۔ اس طرح اس نے حضرت علی ؓ کو خدائی کے مرتبے تک پہنچا دیا۔ دوسرے یہ کہ وہ چونکہ حضور ﷺ کے قریب ترین رشتہ دار ہیں' بنو ہاشم میں سے ہیں' لہٰذا خلافت پر اوّلین حق انہی کا ہے۔ اِس بنیاد پر اُس نے اُمت میں تفرقہ ڈالا اور اُمت میں اس قدر خونریزی ہوئی کہ ایک لاکھ کے قریب مسلمان ایک دوسرے کی تلواروں سے قتل ہوئے۔ حضرت علی ؓ کا پورا دورِ خلافت باہمی خون ریزی اور جنگ و جدال کے اندر گزرا۔ اسی طرح انہوں نے عیسائیوں کو پروسٹنٹس اور کیتھولکس میں تقسیم کر دیا۔ اور پروسٹنٹس یہودیوں کے آلۂ کار بن گئے۔ سو سال پہلے تک پروسٹنٹس کا امام برطانیہ تھا' لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد سے اس کا امام امریکہ ہو گیا۔ کچھ یہودی اور پروسٹنٹس برطانیہ اور امریکہ کو 'New Israel'' کہتے ہیں۔ یعنی اصل میں یہ اسرائیل ہی ہے۔ وہاں پر اگرچہ بظاہر اسرائیل کا قبضہ نہیں ہے' لیکن کنٹرول ان کا ہے۔ برطانوی حکومت ہو یا امریکی حکومت ہو' اس پر کنٹرول یہودیوں کا ہے۔ علامہ اقبال چونکہ امریکہ نہیں گئے لہٰذا وہاں کے حالات تو وہ نہیں دیکھ سکے' لیکن ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک انہوں نے تین سال برطانیہ اور یورپ میں گزارے اور انہوں نے وہاں دیکھ لیا کہ ع ''فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے''۔ اور آج فرنگ کا امام امریکہ ہے لہٰذا آج ''امریکہ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے''۔

ارضِ فلسطین پر عیسائیوں کی نظر میں

عیسائیوں کا معاملہ یہ ہے کہ ارضِ فلسطین سے اُن کا بھی تعلق ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگرچہ ناصرہ (یا نضارت) کے رہنے والے تھے' لیکن جس مقام پر حضرت مریم سلام علیہا کے بطن مبارک سے آپؑ کی پیدائش ہوئی وہ بیت اللحم ہی تھا۔ پھر جہاں انہوں نے تبلیغ کی وہ سارا علاقہ فلسطین ہی کا تو ہے! آپؑ گلیلی جھیل سے لے کر' جو بالکل شمال میں ہے' یروشلم تک اِس پورے علاقے میں تبلیغ کرتے رہے ہیں۔ پھر عیسائیوں کے قول کے مطابق اسی یروشلم شہر کے اندر انہیں صلیب دی گئی۔ وہ صلیب آج تک محفوظ ہے جس پر اُن کے خیال کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام مصلوب کئے گئے تھے۔ لہٰذا عیسائیوں کی پوری تاریخ بھی فلسطین سے وابستہ ہے اور یہودیوں کی تاریخ بھی اسی سے وابستہ ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ یہودیوں کو اللہ نے جبل طور پر تورات دی تھی جو صحرائے سینا میں واقع ہے۔ جیسے حضور ﷺ پر پہلی وحی جبل نور پر غار حرا میں نازل ہوئی اسی طرح جبل طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے اور پھر وہیں پر اُن کو تورات دی گئی۔ عیسائیوں کی نظر میں بھی فلسطین مذہبی اعتبار سے اہم ترین اور مقدس ترین علاقہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے ایک ہزار سال بعد (جدید اصطلاح میں کہا جائے گا کہ سیکنڈ ملینیم کے آغاز پر) انہوں نے اپنی ارضِ مقدس کو مسلمانوں کے قبضے سے واگزار کرنے کے لئے صلیبی جنگیں (Crusades) کیں' جن میں انتہائی خونریزی ہوئی۔ ان کروسیڈز کے پہلے ریلے میں' جبکہ مسلمان ابھی تیار نہیں تھے' بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں میں مسلمانوں کی اکثر بستیاں تباہ و برباد ہو گئیں۔ ۱۰۹۹ء میں عیسائیوں نے یروشلم فتح کر لیا اور وہاں لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا۔ یورپی مؤرخین لکھتے ہیں کہ جب عیسائی فاتحین کے گھوڑے یروشلم میں داخل ہوئے تو اُن گھوڑوں کے گھٹنوں تک خون کا دریا بہہ رہا تھا۔ مسلمانوں پر ایسا عذاب آیا۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ ۸۸ سال بعد ۱۱۸۷ء میں اس نے ایک مردِ مجاہد صلاح الدین ایوبی کو اٹھایا' جس نے عیسائیوں کو شکست دی اور یروشلم

واپس لے لیا۔ اس کے بعد بھی تین چار کوششیں ہوئی ہیں۔ کروسیڈز ایک دفعہ نہیں بلکہ کئی دفعہ ہوئے ہیں۔ تاہم اب امریکہ کے پروٹسٹنٹ عیسائی کہہ رہے ہیں کہ فیصلہ کن ''Last Crusade'' شروع ہونے والا ہے' جب مسلمانوں کے ایک ایک بچے کو فلسطین سے نکال دیا جائے گا اور یہ زمین پاک کر دی جائے گی۔ ''The Philadelphia Trumpet'' کی اشاعت بابت اگست ۲۰۰۱ء میں اس کے ایڈیٹر کی طرف سے یہ عبارت شائع ہوئی ہے کہ:

"Most people think the crusades are a thing of the past —— over forever. But they are wrong. Preparations are being made for a final crusade, and it will be the bloodiest of all."

''اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ صلیبی جنگیں تو پرانے زمانے کی ایک بات ہے' جو اب ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکی ہیں۔ لیکن اُن کا یہ خیال غلط ہے۔ اب ایک فائنل کروسیڈ کے لئے تیاریاں ہو رہی ہیں' اور یہ (آخری صلیبی جنگ) پچھلی تمام جنگوں سے زیادہ خونی ہوگی''۔

یہود کا ایجنڈا اور فلسطین کا مستقبل

اب مستقبل کیا ہے؟ آئندہ کے حالات سامنے آ گئے ہیں۔ سن ۷۰ء سے نکالے ہوئے یہودی جن کی انتہائی persecution ہوئی ہے' اب ارضِ فلسطین پر قابض ہیں۔ پہلے کروسیڈز میں جہاں مسلمانوں کا قتل عام ہوا ہے' اس کے برابر یہودیوں کا بھی ہوا ہے' کیونکہ عیسائیوں کو یہودیوں سے بھی شدید نفرت تھی۔ ایک قوم (عیسائی) حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا مانتی ہے جبکہ دوسری (یہود) انہیں حرام زادہ' واجب القتل' کافر اور مرتد ٹھہراتی ہے (نعوذ باللہ)۔ تو اِن دونوں قوموں میں کوئی مصالحت کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ تاریخ کا معجزہ ہے اور یہودیوں کی محنت' جدوجہد' کوشش' سازشی انداز' منصوبہ بندی اور دوراندیشی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے عیسائیوں کو' جو یہودیوں کے خون کے پیاسے تھے اور اُن سے انتہائی نفرت کرتے تھے' رفتہ رفتہ دو فرقوں میں تقسیم کر دیا۔ پروٹسٹنٹس کو انہوں نے اپنا آلۂ کار بنایا اور آج پوری عیسائی دنیا اُن کے

قبضۂ قدرت میں ہے۔

یہودیوں کا ایجنڈا کیا ہے؟ بائبل میں آرمیگاڈان (Armageddon) کی خبر دی گئی ہے کہ بہت بڑی جنگ ہوگی۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہ جلد از جلد ہو جائے۔ اس جنگ کی حدیث میں بھی خبر ہے اور اسے اَلْمَلْحَمَۃُ الْعُظْمٰی اور اَلْمَلْحَمَۃُ الْکُبْرٰی کہا گیا ہے۔ تاریخ انسانی کی یہ سب سے بڑی جنگ کئی سالوں پر پھیلی ہوگی۔ انگریزی میں جنگ کے لئے warاور battle دو لفظ استعمال ہوتے ہیں۔ warایک بڑا لمبا پراسیس ہوتا ہے۔ اس سے ایسی جنگ مراد ہوتی ہے جو کئی سالوں پر محیط ہو۔ جیسے محمد رسول اللہ ﷺ اور مشرکین مکہ کے درمیان چھ سالہ جنگ (war) رہی' جس کے دوران کئی جنگیں (battles) ہوئیں۔ جنگ بدر' جنگ اُحد اور جنگ احزاب سب battles تھیں۔ تو تاریخِ انسانی کی سب سے بڑی جنگ (battle) اگرچہ چھوٹے سے علاقے میں ہوگی' لیکن خون ریزی کے اعتبار سے دنیا کی تاریخ کی کوئی جنگ اس کے مساوی نہیں ہوگی۔ تو یہود چاہتے ہیں کہ پہلے تو آرمیگاڈان کے نتیجے میں عظیم تر اسرائیل قائم ہو جائے۔ اس کے لئے کوشش ہو رہی ہے۔ ذرا سوچئے کہ امریکہ نے عراق پر کیوں حملہ کیا! ابھی تک کوئی وجہ سامنے نہیں آ سکی۔ کوئی وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار (WMD) وہاں سے برآمد نہیں ہوئے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ تیل کے لئے کیا گیا۔ قطعاً نہیں! یہ دراصل گریٹر اسرائیل کی طرف پہلا قدم ہے۔ ۱۹۹۱ء کی خلیجی جنگ کے اتحادی کمانڈر انچیف نے بعد میں صاف کہہ دیا تھا کہ ''We fought for the protection of Israel.'' یہودیوں کا claim ہے کہ ہم نے گریٹر اسرائیل بنانا ہے۔ پہلے کہتے تھے کہ فرات تک ہمارا علاقہ ہے' اب کہتے ہیں دریائے دجلہ بھی ہمارا ہے۔ سقوطِ بغداد کے وقت اسرائیلی وزیراعظم شیرون نے صاف کہہ دیا تھا کہ عنقریب عراق پر ہمارا قبضہ ہوگا۔ یہ ساری تیاری اس کے لئے ہے۔ یہ یہودی ہیں جو بش اور اس کے ساتھیوں کو چابی دے رہے ہیں۔

اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کا واقعہ کرنے والے بھی یہودی ہیں۔ تازہ

ندائے خلافت (شمارہ ۱۵) میں عابداللہ جان کا چشم کشا مضمون شائع ہوا ہے' جس میں انہوں نے Alex Jones کی کتاب کے حوالے سے لکھا ہے کہ ۹/۱۱ درحقیقت CIA کا کارنامہ تھا۔ سیمپوزیم آف ملٹری اینڈ سویلین پائیلٹس کے سیمینار میں تمام پائلٹس نے یہ بات کہی کہ اس طرح کا attack کسی پائیلٹ کے لئے ممکن ہی نہیں۔ امریکہ میں اب اس بارے میں کوئی تحقیق نہیں ہو رہی کہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کا واقعہ کس نے کیا تھا! شروع میں کچھ کارروائی ہوئی تھی' لیکن اس کی بعض باتیں لیک ہونے پر معاملہ فوراً ٹھپ کر دیا گیا' کیونکہ وہ کھرا تو اسرائیل تک پہنچ رہا تھا۔ بہرحال یہودیوں کا ایجنڈا یہ ہے کہ سب سے پہلے آرمیگاڈان جلد از جلد ہو جائے جس کے نتیجے میں گریٹر اسرائیل قائم ہو۔ وہاں پر وہ اپنا تیسرا معبد سلیمانی (تھرڈ ٹمپل) تعمیر کریں گے' جس کے لئے مسجد اقصیٰ اور گنبد صخرہ دونوں کو گرایا جائے گا۔ تھرڈ ٹمپل کی تعمیر کے بعد وہاں پر تخت داؤد لاکر رکھا جائے گا اور اس پر وہ مسیحا آ کر بیٹھے گا جس کا انہیں انتظار ہے۔ پروٹسٹنٹ عیسائی بھی یہودیوں کے اس ایجنڈے کے ساتھ منسلک ہو گئے ہیں اور وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ آرمیگاڈان جنگ جلد ہو' گریٹر اسرائیل قائم ہو اور تھرڈ ٹمپل بنے۔

میثاق کی خصوصی اشاعت (بابت اپریل ۲۰۰۴ء) کے بیک ٹائٹل پر ہم نے ''The Philadelphia Trumpet'' سے لے کر مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرۃ کی ایک تصویر شائع کی ہے اور اندرونی صفحہ پر یہود و نصاریٰ کے عزائم کے بارے میں تحریر شائع کی ہے۔

یہودی جو ''تھرڈ ٹمپل'' تعمیر کرنا چاہتے ہیں یہ ٹمپل آف ماؤنٹ کہلاتا ہے۔ یروشلم کے مشرقی علاقے کے اندر اونچی پہاڑی جگہ پر ایک بالکل ہموار میدان ہے جس کو وہ ''Temple of Mount'' کہتے ہیں۔ یہ ایک ایسی مستطیل ہے جو شمالاً جنوباً لمبی ہے لیکن شرقاً غرباً اس کی چوڑائی کم ہے۔ اس مستطیل کے شمالی علاقے میں قبۃ الصخرۃ (Dome of the Rock) ہے' جو اس چٹان پر اموی حکمران عبدالملک بن مروان اور ولید بن عبدالملک نے بنوایا تھا جس سے معراج شریف میں نبی اکرم ﷺ کا آسمانی

سفر شروع ہوا تھا۔ اسی مناسبت سے میں نے آغاز میں اس آیۂ مبارکہ کی تلاوت کی تھی:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۝﴾(بنی اسراء یل)

''پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دُور کی اُس مسجد تک جس کے ماحول کو اُس نے برکت دی ہے تاکہ اُسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔ حقیقت میں وہی سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے۔''

اس علاقے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ اس کا ماحول ہم نے بابرکت بنایا ہے۔ اس لئے کہ سینکڑوں انبیاء وہاں دفن ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر دو ہزار برس تک جتنے انبیاء کا ذکر ہمیں ملتا ہے' سب کے سب وہیں دفن ہوئے ہیں۔ اب پروٹسٹنٹ عیسائیوں اور یہودیوں کا اس بات پر گٹھ جوڑ ہے کہ یہاں تھرڈ ٹمپل تعمیر ہونا چاہئے۔

دوسری طرف پروٹسٹنٹ عیسائیوں اور کیتھولکس کے درمیان مذہب کے نام پر جتنی خونریزی ہوئی ہے' دنیا میں کبھی نہیں ہوئی۔ ''The Blood on the Cross'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب شائع ہوئی تھی جس میں عیسائیوں کی باہمی خانہ جنگیوں کا ذکر ہے۔ یورپ میں اس بنیاد پر جس قدر خانہ جنگیاں ہوئی ہیں' اس کا آپ تصور نہیں کر سکتے۔ سارے پروٹسٹنٹس یہاں سے مار مار کر بھگا دیئے گئے' جو امریکہ میں جا کر آباد ہوئے۔ یورپ کا بڑا حصہ کیتھولکس پر مشتمل ہے۔ سپین' اٹلی' فرانس' جرمنی سب کیتھولکس ہیں۔ پروٹسٹنٹس یورپ سے جان بچا کر بھاگے اور انہوں نے امریکہ کے اندر اپنی نئی دنیا بسائی ہے اور وہاں وہ غالب ہیں۔ بعض یہودی اور بعض پروٹسٹنٹ عیسائی برطانیہ اور امریکہ کو New Israel کہتے ہیں' اس لئے کہ یہاں یہودیوں کو طاقت اور کنٹرول حاصل ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہماری ذلت اور کمزوری کا دور ختم ہوا' اب دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں ہماری مٹھی میں ہیں اور پوری دنیا کی اقتصادیات ہمارے کنٹرول

میں ہیں۔ امریکی حکومت یہودیوں کے بینکوں کی کھرب ہا کھرب ڈالر کی مقروض ہے۔ لہٰذا اس وقت امریکہ کی رگِ جاں پوری طرح پنجۂ یہود میں ہے۔ بہرحال کیتھولکس کی چونکہ پروٹسٹنٹس کے ساتھ دشمنی ہے اس لئے درحقیقت اب یورپ میں Last Crusade کی تیاری ہو رہی ہے۔ یورپ کو دوبارہ متحد کیا جا رہا ہے' جیسے کبھی رومن امپائر ہوتی تھی اور پورا یورپ تقریباً ایک بادشاہ کے تحت ہوتا تھا۔ یہ اصل میں پوپ کی طرف سے کروایا جا رہا ہے تاکہ بہت بڑی رومن کیتھولک امپیریلزم قائم ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ پروٹسٹنٹ عیسائی پوپ کو شیطان کہتے ہیں۔ نیٹو سے علیحدہ ہو کر یورپ کی اپنی الگ فوج بنانے کی تیاریاں بھی اسی منصوبے کا حصہ ہیں تاکہ یہ امریکی کنٹرول سے آزاد ہو سکیں۔ گویا یہ صرف اقتصادی معاملہ نہیں ہے بلکہ امریکہ اور یورپ کے درمیان ایک بنیادی معاملہ ہے۔

پروٹسٹنٹس کا کہنا یہ ہے کہ کیتھولک عیسائی فلسطین کو فتح کرنا چاہتے ہیں' تاکہ یہودیوں اور مسلمانوں کو ختم کر کے وہاں پر کیتھولک عیسائی ریاست قائم ہو جائے' جیسے انڈونیشیا کے ایک بڑے جزیرے کو تقسیم کرا کے ایسٹ تیمور میں کیتھولک عیسائیوں کی حکومت قائم کر دی گئی۔ اسی طرح کی کوششیں نائجیریا میں ہو رہی ہیں۔ وہاں پر کیتھولک عیسائی مسلمانوں کے خلاف برسرپیکار ہیں اور نائجیریا کے ایک بڑے حصے پر رومن کیتھولک حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ بہرحال یہودیوں' رومن کیتھولکس اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں تینوں کی نگاہ اس وقت ارضِ فلسطین پر ہے۔

الٰہی خیر میرے آشیاں کی
زمیں پر ہیں نگاہیں آسماں کی!

اب اس کا حل کیا ہے؟ ایک اصولی اور مبنی برانصاف حل تو وہ ہے جو شروع سے پی ایل او کا مطالبہ تھا' اور اب بھی حماس کا مطالبہ ہے کہ اسرائیل کا قیام ناجائز طور پر ہوا تھا' ہمارے اوپر ظلم کر کے یہاں یہودیوں کو آباد کیا گیا' اس لئے اسرائیل کو ختم ہونا چاہئے اور پورے کا پورا فلسطین اس کے اصل رہنے والوں کو دیا جانا چاہئے۔ ان کے

اس مطالبے میں تقریباً تمام عرب ممالک ان کے ساتھ تھے۔ لیکن اصل فیصلہ تو طاقت کرتی ہے۔ ع ''ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات''۔ دنیا کی واحد سپریم پاور امریکہ اسرائیل کی پشت پر ہے۔ اہل یورپ سے بھی کبھی کبھی امیدیں باندھ لی جاتی ہیں کہ وہ کچھ یہودیوں کے خلاف اور فلسطینیوں کے حق کی بات کر دیتے ہیں' لیکن ان کا بھی اصل ایجنڈا یہی ہے کہ یہاں سے یہودیوں اور مسلمانوں سب کو نکال کر رومن کیتھولک حکومت قائم کی جائے۔

ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے!

جنہوں نے ہم سے صلیبی جنگیں لڑیں اور لاکھوں مسلمانوں کو تہ تیغ کیا' ان سے امید کی جا رہی ہے کہ وہ اہل فلسطین کو ان کا حق دلا دیں گے!

بہرحال یہ صورتِ حال ہے۔ ہمارے ہاں بھی کہا جاتا ہے کہ بھئی زمینی حقائق کو دیکھو۔ اصولی بات تو یہ ہے کہ پورا کشمیر پاکستان کا حصہ ہے' لیکن بھارت آپ کو ایک انچ زمین بھی دینے کو تیار نہیں' لہٰذا کہا جاتا ہے کہ کچھ لو کچھ دو کی بنیاد پر بات کر لی جائے۔ بھارت سے اس سے زیادہ کوئی توقع نہیں کہ کنٹرول لائن کو مستقل سرحد بنا دیا جائے۔ اسی طرح کا معاملہ فلسطین کا ہے کہ ایک زمانہ ہوا پی ایل او اپنے اصولی موقف سے دستبردار ہو چکی ہے اور اب اس کا موقف یہ ہے کہ اچھا ٹھیک ہے' اسرائیل بھی رہے لیکن ایک فلسطینی ریاست بھی بن جائے۔ اب اس صورتِ حال کو بھی بارہ تیرہ سال گزر گئے ہیں۔ اس پر کبھی اوسلو' کبھی میڈرڈ اور کبھی کیمپ ڈیوڈ میں مذاکرات ہو رہے ہیں' لیکن بظاہر اس مسئلے کا کوئی حل ہے ہی نہیں۔ اس چھوٹے سے جغرافیہ پر اتنے لوگوں کی نگاہیں ہیں اور بے چارہ مسلمان وہاں پر پٹ رہا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو موجودہ حالات میں پی ایل او کی بات بھی کسی درجے میں صحیح ہے۔ امریکہ کے سامنے سر جھکانے کے علاوہ اور کیا چارۂ کار ہے!

بہرحال آج جو صورتِ حال میں بتانے آیا تھا وہ یہ ہے کہ آرمیگاڈان اب زیادہ

دور نہیں ہے۔ اس کے لئے یورپ بھرپور تیاریاں کر رہا ہے اور متحد ہو رہا ہے۔ پوپ کی طرف سے بھی یہ بات آ گئی ہے کہ یورپ کے دستور میں لکھ دیا جائے کہ اس کا سرکاری مذہب کیتھولک عیسائیت ہے۔

آج کل ایک عجیب بات قبرص کے حوالے سے بھی دیکھنے میں آ رہی ہے۔ کوفی عنان صاحب وہاں بار بار آ رہے ہیں۔ اصل میں نیٹو افواج کا صدر مقام پہلے جرمنی تھا' وہاں سے یہ کوسوو کی طرف منتقل ہوا۔ اب وہاں سے ان کا اگلا قدم قبرص ہے۔ وہیں اصل ''جمپنگ پیڈ'' بنے گا۔ فلسطین یہاں سے بہت قریب ہے' لہٰذا یہیں سے حملہ ہوگا' اور اس حملے میں اتنی خون ریزی ہوگی کہ اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے' کیونکہ جب تک یہود مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو نہ گرائیں ان کا تھرڈ ٹمپل نہیں بنتا۔ قبضہ ان کے پاس ہے اور دنیا کی عظیم ترین عسکری قوت ان کی پشت پر ہے۔ اب اس سے بڑی بات کیا ہوگی کہ اسرائیلی وزیراعظم شیرون نے فیصلہ کیا ہے کہ غزہ کی پٹی پر قائم چند یہودی بستیوں کو تو ہم خالی کر دیں گے' جس کا رقبہ محض 140 مربع میل ہے' لیکن مغربی کنارے پر ہم اپنی بستیاں نہیں گرائیں گے اور وہ یہودی علاقہ ہی رہے گا۔ مغربی کنارے کے بارہ چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی مکمل طور پر یہودیوں کے ہو جائیں گے۔ اس طرح فلسطین کے مسلم علاقے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جائیں گے اور یہودی جب چاہیں گے ان کے مابین مواصلات روک دیں گے۔ ان بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو ایک ریاست کی شکل کیسے دی جا سکتی ہے؟ اس سے پہلے امریکہ کا موقف یہ تھا کہ اسرائیل پورا ویسٹ بینک واپس کر دے جس پر اُس نے ۱۹۶۷ء کی جنگ میں قبضہ کیا تھا اور یہاں غزہ کی پٹی میں فلسطینی ریاست قائم کر دی جائے۔ لیکن اب صدر بش نے شیرون کے منصوبے کی نہ صرف منظوری دے دی ہے بلکہ اس پر اسے داد دی ہے۔ اس سے آگے یہ معاملہ ہوا ہے کہ صدر حسنی مبارک نے اپنے حالیہ دورۂ امریکہ کے دوران بش پر یہ واضح کیا ہے کہ مشرق وسطیٰ میں امن کا عمل طویل ہونے اور روڈ میپ پر اسرائیل کے کاربند نہ ہونے سے عرب دنیا میں بے چینی اور اضطراب بڑھ رہا ہے۔

عوام یہ صورت حال کب تک برداشت کریں گے! عرب نوجوانوں کے اندر یہودیوں کی نفرت رچی ہوئی ہے۔ لہٰذا ''تنگ آمد بجنگ آمد'' کے مصداق وہ اٹھیں گے۔ اور پھر Holocaust ہوگا۔ اس میں سب سے پہلے امریکہ کے ایجنٹوں کی صورت میں جو مسلمان حکمران بیٹھے ہوئے ہیں وہ اپنے نوجوانوں کو ختم کریں گے۔ ملت عرب کے لئے انتہائی خون ریز معاملہ آنے والا ہے' از روئے حدیثِ نبویؐ: ((وَیْلٌ لِلْعَرَبِ، مِنْ شَرٍّ قَدِ اقْتَرَبَ)) یہ ہے وہ ہولناک منظر جسے حضورﷺ نے الملحمۃ العظمٰی اور الملحمۃ الکبریٰ یعنی تاریخ انسانی کی عظیم ترین جنگ سے تعبیر کیا ہے۔ مستقبل سوائے اس کے اور کوئی نہیں۔ کوئی راستہ نہیں ہے!

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

ربّ ذوالجلال کی عبادت

آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں

انتخاب وترتیب: حافظ محمد سلیمان

عبادت صرف اسی ربّ ذوالجلال کی کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا' تمہارے لئے طرح طرح کی نعمتیں پیدا کیں۔ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کی عبادت نہ کرو کہ وہ خالق نہیں' خود مخلوق ہیں اور مخلوق کی عبادت کرنا قوت اور عزت والے خالقِ کائنات کی بے قدری ہے۔ اس موضوع پر چند قرآنی آیات اور ایک حدیث نبویؐ کا مطالعہ کرتے ہیں۔

۱) صرف اُس اللہ کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا' تم سے پہلوں کو پیدا کیا' زمین کا فرش بچھایا' آسمان کی چھت بنائی' بارش برسائی اور اس کے ذریعے تمہیں ہر طرح کی پیداوار کا رزق دیا۔ جانتے بوجھتے دوسروں کو اللہ کا مدمقابل نہ ٹھہراؤ۔ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۖ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (البقرۃ: ۲۱'۲۲)

''لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے اس ربّ کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں اُن سب کا خالق ہے' تمہارے بچنے کی توقع اسی صورت میں ہو سکتی ہے۔ وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کا فرش بچھایا' آسمان کی چھت بنائی' اوپر سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لئے رزق بہم پہنچایا۔ پس تم جانتے ہوئے دوسروں کو اللہ کا مدمقابل نہ ٹھہراؤ۔''

۲) اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکت ہے' جس نے جہان والوں کو خبردار کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا اور اُن پر فرقان مجید نازل فرمایا۔ وہ اللہ زمین اور آسمان کا مالک ہے' اس کا کوئی شریک نہیں' کوئی بیٹا نہیں' وہ ہر چیز کا خالق ہے۔ اس نے ہر چیز کی

E:\Ms-2005\Meesaaq_Pdf_2005\meesaq january05\hk18-05.inp 8/22/2014 3:47 PM PAGE 1 (1,1)

تقدیر مقرر کی۔ اور یہ مشرک کیسے لوگ ہیں کہ انہوں نے خالق کائنات کو چھوڑ کر ایسے معبود بنا لئے جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے' بلکہ خود پیدا کئے جاتے ہیں۔ اور یہ ایسے ''معبود'' ہیں جو اپنے لئے بھی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے' جو نہ مار سکتے ہیں نہ جلا سکتے ہیں' نہ مرے ہوؤں کو پھر اٹھا سکتے ہیں۔

﴿تَبٰرَکَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِہٖ لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرَا ۙ۝ الَّذِیۡ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلَمۡ یَتَّخِذۡ وَلَدًا وَّلَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ شَرِیۡکٌ فِی الۡمُلۡکِ وَخَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ فَقَدَّرَہٗ تَقۡدِیۡرًا ۝ وَاتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اٰلِـہَۃً لَّا یَخۡلُقُوۡنَ شَیۡئًا وَّہُمۡ یُخۡلَقُوۡنَ وَلَا یَمۡلِکُوۡنَ لِاَنۡفُسِہِمۡ ضَرًّا وَّلَا نَفۡعًا وَّلَا یَمۡلِکُوۡنَ مَوۡتًا وَّلَا حَیٰوۃً وَّلَا نُشُوۡرًا ۝﴾ (الفرقان: ۱۔۳)

''نہایت متبرک ہے وہ جس نے یہ فرقان اپنے بندے پر نازل کیا ہے تاکہ یہ سارے جہان والوں کے لئے خبردار کردینے والا ہو۔ وہ جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے' جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے' جس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک نہیں' جس نے ہر چیز کو پیدا کیا' پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی۔ لوگوں نے اسے چھوڑ کر ایسے معبود بنا لئے جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے' بلکہ خود پیدا کئے جاتے ہیں' جو خود اپنے لئے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے' جو نہ مار سکتے ہیں نہ جلا سکتے ہیں اور نہ مرے ہوئے کو پھر سے اٹھا سکتے ہیں۔''

۳) اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے۔ اس نے سکون کے لئے رات بنائی' دن کو روشن کیا' لوگوں پر فضل فرمایا' باوجود اِس کے کہ اُن میں سے اکثر ناشکرے ہیں۔ اس خالق کائنات کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کو چھوڑ کر مخلوقات میں سے معبود بنانے والے تو بھٹکے ہوئے لوگ ہیں۔

﴿اَللّٰہُ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ لِتَسۡکُنُوۡا فِیۡہِ وَالنَّہَارَ مُبۡصِرًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَشۡکُرُوۡنَ ۝ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمۡ خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ ۘ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۫ فَاَنّٰی تُؤۡفَکُوۡنَ ۝﴾ (المؤمن: ۶۱'۶۲)

''وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لئے رات بنائی تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو' اور دن کو روشن کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے' مگر اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔ وہی اللہ (جس نے تمہارے لئے یہ سب کچھ کیا

ہے) تمہارا ربّ ہے' ہر چیز کا خالق' اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پھر تم کدھر سے بہکائے جا رہے ہو؟''

۴) ایک مثال سنو! اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن معبودوں کو تم پکارتے ہو وہ سارے مل کر بھی ایک مکھی تک پیدا نہیں کر سکتے۔ مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو واپس نہیں لے سکتے۔ کیسے کمزور معبودوں کی مدد چاہتے ہیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ ان مشرکوں نے قوت اور عزت والے اللہ تعالیٰ کی قدر ہی نہ پہچانی جیسا کہ اس کے پہچاننے کا حق ہے۔

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْـًٔا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝﴾ (الحج:۷۳'۷٤)

''لوگو! ایک مثال دی جاتی ہے' اسے غور سے سنو۔ جن معبودوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے' بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے۔ مدد چاہنے والے بھی کمزور اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور۔ ان لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہ پہچانی جیسا کہ اس کے پہچاننے کا حق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قوت اور عزت والا تو اللہ ہی ہے۔''

۵) کم بخت مشرک کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اولاد رکھتا ہے۔ اس تکلیف کی بات کو اور بے قدری کرنے والے افتراء کو اللہ تعالیٰ سنتا ہے' پھر بھی صبر کرتا ہے' اور ان مشرکوں کو چنگا بھلا کرتا ہے اور ان کو روزی دیتا ہے۔

عَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ ﷺ : ((مَا اَحَدٌ اَصْبَرَ عَلٰی اَذًی سَمِعَهٗ مِنَ اللّٰهِ یَدْعُوْنَ لَهُ الْوَلَدَ ثُمَّ یُعَافِیْهِمْ وَیَرْزُقُهُمْ)) (صحیح البخاری' کتاب التوحید' باب قول اللّٰہ تعالیٰ: اَنَا الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِیْنُ)

''حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ سے زیادہ تکلیف کی بات سن کر صبر کرنے والا کوئی نہیں۔ کم بخت مشرک کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے' باوجود ایسی باتوں کے وہ ان مشرکوں کو چنگا بھلا کرتا ہے اور ان کو روزی دیتا ہے۔''

تذکیر و موعظت

اسلام کی بنیادی اقدار

مولانا سید وصی مظہر ندوی

انسان جو کام کرتا ہے ان میں سے کچھ کام اچھے ہوتے ہیں اور کچھ کام برے۔ کسی عمل کو وہ خیر تسلیم کرتا ہے اور کسی عمل کو شر قرار دیتا ہے۔ یہ تقسیم انسان کی فطرت کا عین تقاضا ہے۔ حیوانوں میں سے کسی اور حیوان میں اس تقسیم کا کوئی شعور نہیں پایا جاتا۔ اس لحاظ سے انسان کو اخلاقی حیوان کہنا بجا ہوگا۔

لیکن خیر و شر اور معروف و منکر کی یہ تقسیم اگرچہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے لیکن انسانوں کے درمیان بہرحال اس سلسلہ میں کئی بنیادی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کسی عمل کے خیر یا شر ہونے کی کسوٹی کیا ہے؟ یا یہ کہ کون سے اخلاق بنیادی ہیں جن کے اوپر دوسرے اخلاقی اوصاف قائم ہوتے ہیں اور کون سے اخلاق ثانوی درجہ رکھتے ہیں جن کو بنیادی اخلاق کے مقابلے میں اگر قربان کرنا پڑے تو قربان کیا جا سکتا ہے۔

اسی اختلاف کی وجہ سے انسان مختلف سماجوں اور تہذیبوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ انسانوں کے لئے جو بھی نظامِ زندگی ترتیب دیا جائے گا اس میں اچھے اور برے اخلاق اور خوب و ناخوب میں فرق کرنے کے لئے کچھ بنیادی قدریں ضرور طے کی جائیں گی۔ کیونکہ ان ہی بنیادی قدروں کی کسوٹی پر اس تہذیب اور نظام کی گود میں پلنے والے سماج کے ہر انفرادی اور اجتماعی عمل کو پرکھا جاتا ہے۔

اسلام امن اور سلامتی کا علمبردار ہے، اخوت اور ہمدردی کا دین ہے، عدل اور مساوات کا قیام اس کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔ لیکن ان تمام اعلیٰ اقدار کا محافظ ہونے کے ساتھ ساتھ سوال یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کی بنیادی قدریں کون سی ہیں؟ اس سوال کا جواب ہر مفکر نے اپنی فکر کے مطابق دیا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ جامع اور شریعت اسلامی کے گہرے مطالعہ پر مبنی جواب وہ ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے۔ ان کی بحث کا

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کی بنیادی قدریں چار ہیں۔طہارت' اخبات' سماحت اور عدالت۔

انسان فطری طور پر گندگی کو ناپسند کرتا ہے۔ پاکیزگی اور صفائی کو پسند کرتا ہے۔انسان کے اس فطری تقاضے کے تحت اسلام نے ظاہری اور باطنی نجاست اور گندگی سے دور رہ کر صفائی اور پاکیزگی کو اختیار کرنے کے لئے جامع احکام اور ہدایات جاری کی ہیں۔چنانچہ جسم اور لباس کی پاکیزگی' وضو اور غسل کے احکام اور خوشبو وغیرہ کے استعمال کی ہدایات کا ایک وسیع باب اسلامی شریعت میں موجود ہے۔انسان جب طہارت حاصل کر لیتا ہے تو اس کا باطنی نور مادی اندھیروں سے گزر کر اپنے خالق' مالک اور پروردگار کی معرفت حاصل کر لیتا ہے۔

اس معرفت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان اپنے ربّ کی عظمت کے نور اور اپنے ضعف و مسکنت کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔اس کی وجہ سے اخبات کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔یعنی اپنے ربّ کی عظمت کے سامنے سر جھکا دینا' عاجزی اور تذلل اختیار کرنا۔اس کیفیت کا پہلا درجہ اسلام ہے۔یعنی اپنے آپ کو پروردگار کے حوالے کر دینا اور اس کی اطاعت اور فرماں برداری کو اختیار کر لینا۔ دوسرا درجہ تقویٰ ہے' یعنی اپنے ہر ایسے قول یا عمل سے بچنا جو پروردگار کی ناراضگی کا سبب بن سکتا ہو۔اخبات کا تیسرا اور اعلیٰ مرتبہ ''احسان'' ہے۔احسان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت اتنے اچھے طریقے پر کی جائے کہ گویا بندہ اپنے مالک کو دیکھ رہا ہے۔

اخبات کی صفت میں آدمی جتنا بڑھتا جاتا ہے اس میں اسی قدر سماحت کی صفت پیدا ہوتی ہے۔یعنی دنیا اور متاع دنیا کی محبت سے آدمی کا دل خالی ہو جاتا ہے۔وہ یہاں کے تمام ساز و سامان کو استعمال تو ضرور کرتا ہے مگر اُن کے عشق میں مبتلا نہیں ہوتا' اور جب بھی اس کو دنیا کی کسی شے سے ہاتھ اٹھانا پڑتا ہے تو اس طرح ہاتھ اٹھا لیتا ہے کہ اس کے دل میں اس چیز کو چھوڑنے کا ذرا بھی ملال نہ ہو۔یعنی مؤمن اس ''بُت خانۂ رنگ و بو'' کو اپنے جال میں گرفتار کر لیتا ہے اور اس سے اپنی خدمت لیتا ہے۔سماحت کی صفت پیدا ہونے سے انسان کے اندر راہِ خدا میں صرف کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے' دوسروں کے حقوق خوش دلی سے ادا کرتا ہے' اس میں ایثار کی صفت پیدا ہوتی ہے اور جان و مال کی ہر قربانی دینا اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔

سماحت کی اس صفت کی تخلیق' تربیت اور تقویت کے لئے نظامِ اسلام میں احکام'

قوانین اور ہدایات کا ایک وسیع باب موجود ہے۔ زکوٰۃ کی فرضیت' صدقاتِ واجبہ' قربانی' رشتہ داروں' پڑوسیوں' مہمانوں' مسافروں اور دوستوں کے حقوق کی تاکید' راہِ خدا میں جان و مال کی قربانی دینے کا مطالبہ اسی بنیادی قدر یعنی سماحت کا تقاضا ہیں۔

اسلامی نظام کی چوتھی بنیادی قدر عدالت ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اعمال کا محرک ذاتی مفادات کا حصول نہ ہو' بلکہ آدمی جو کچھ کرے کسی اعلیٰ مقصد یا اجتماعی مفاد کے حصول کے لئے کرے' حتیٰ کہ اپنے نفس کے تقاضے بھی اس نیت کے ساتھ پورے کرے کہ نفس کے یہ حقوق اللہ تعالیٰ نے متعین فرمائے ہیں اور ان حقوق کو ادا کر کے وہ اپنے فرائض بہتر طور پر ادا کر سکتا ہے۔ عدالت کی بنیادی قدر کے نتیجہ میں معاشرے میں عدل کا قیام' حقوق سے زیادہ فرائض کی ادائیگی کی جانب توجہ اور نفسی نفسی کے بجائے ایثار اور خدا ترسی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

طہارت' اخبات' سماحت اور عدالت کو اسلام میں بنیادی اقدار کی حیثیت حاصل ہے۔ انہی قدروں کے معیار پر ہر قول و عمل کی قدر و قیمت معین کی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ تمام نیکیاں اور سچائیاں جن کو تمام انسان اپنے فطری تقاضے کے طور پر نیکی اور سچائی مانتے ہیں وہ بھی اسی وقت نیکی اور سچائی قرار پاتی ہیں جب وہ ان بنیادی قدروں سے ہم آہنگ ہوں۔ اسی طرح سے جن کاموں کو برا سمجھا جاتا ہے وہ اسی وقت برے تصور کئے جائیں گے جب وہ ان بنیادی اقدار سے ٹکراتے ہوں۔

صداقت' شجاعت' سخاوت اور عفت کو تقریباً تمام نظاموں میں اعلیٰ اخلاقی قدر کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان اوصاف کے برعکس جھوٹ' بزدلی' بخل اور بے راہ روی کو ہر نظام میں برا سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ہر نظام کی طرح اسلام میں بھی ان کی قدر و قیمت کا تعین اسلام اپنی بنیادی اقدار کی روشنی میں کرتا ہے۔ غرضیکہ اسلامی نظامِ زندگی کو دوسری تہذیبوں سے ممتاز کرنے والی قدریں یہی ہیں۔

تہذیب کا زہر

تحریر: حبیب اللہ شاہد

۵ ستمبر ۱۹۹۴ء کو قاہرہ میں بہبودِ آبادی کے موضوع پر ہونے والی متنازعہ عالمی کانفرنس کے مضبوط پس منظر میں ۶ ستمبر ۱۹۹۵ء کو بیجنگ میں خواتین کے موضوع پر چوتھی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں جو سفارشات پیش کی گئیں وہ ایک ننگ انسانیت ایجنڈے پر مشتمل ہیں۔ اس اجتماع میں مستعمل آزادی، حقوق، معاشی ترقی اور بہبود کی خوبصورت و شیریں اصطلاحات میں پوشیدہ زہر ہلاہل کے بارے میں اگرچہ انگریزی صحافت اور سرکاری ذرائع ابلاغ نے پردے ڈالے تاہم دینی صحافت کے حوالے سے عوام الناس کو کچھ نہ کچھ آگاہ کیا گیا۔ بدقسمتی سے ہمارے اہل علم و قلم اور خاص طور پر ملتِ بیضا کا درد رکھنے والے اصحاب نہ صرف بین الاقوامی سطح پر بلکہ خود اپنے ملک میں بھی ملت اسلامیہ کو شمال (امریکہ و یورپ کے لئے ''مغرب'' کی مترادف اصطلاح) کی جانب سے اٹھنے والے اس طوفان سے کماحقہ آگاہ نہ کر سکے جو اس کی اعلیٰ اقدار کو بہالے جانے کے لئے اپنی پوری طاقت کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ اضطراب، فکرمندی اور پیش بندی کی عدم موجودگی کے باعث حکومتی سطح پر وہ دباؤ ہی نہ ڈالا جا سکا جس کو مدنظر رکھتے ہوئے سرکاری مندوب پُراعتماد لہجے میں پاکیزہ اسلامی معاشروں میں انارکی پیدا کرنے کی ناپاک جسارت کو مضبوط دلائل کے ساتھ بیجنگ فورم پر چیلنج کرتے۔

اس مرحلے پر نہایت معذرت کے ساتھ یہ کہنے کی اجازت بھی مرحمت فرمائیے کہ ماسوائے استثناء کے چند دینی جماعتوں یا شخصیات نے اس موقع پر احتجاج درج بھی کرایا تو صرف اپنی دکان چمکانے کے لئے، وگرنہ حالات کا تقاضا تو یہ تھا کہ دین کے لئے کام کرنے والی تمام جماعتیں مشترکہ طور پر متحد ہو کر شمال کی ناپاک کوششوں پر پانی پھیرنے کی سعی کرتیں۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ اگر مستقبل میں ان جماعتوں نے یہی رویہ اپنائے رکھا اور متحد ہو کر کفر کے مقابلے پر نہ اتریں تو ملت بیضا کے ریزہ ریزہ ہونے میں شمالی طاقتوں کے ساتھ برابر کی مجرم گردانی جائیں گی۔

قاہرہ و بیجنگ کانفرنسوں کا شیطانی ایجنڈا

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ قاہرہ و بیجنگ کانفرنسوں کا مقصد پوری دنیا بالخصوص عالم اسلام میں فحاشی' بدکاری' بے حیائی' آزادانہ شہوت رانی اور جنسی انارکی پیدا کرنا ہے۔ قاہرہ کانفرنس اگر کنڈوم کلچر کو بین الاقوامی طور پر متعارف کرانے کی پہلی کامیاب کوشش تھی تو بیجنگ کانفرنس کا مقصد بین الاقوامی طور پر لادینی و سیکولر معاشرے کا قیام' حقوقِ نسواں کے حوالے سے شادی شدہ زندگی کی حوصلہ شکنی' ہم جنس پرستی' جسم فروشی اور اسقاطِ حمل کی قانونی اجازت دے کر معاشرتی اقدار کو غرقاب کرنا ہے۔ بیجنگ کانفرنس میں جو سفارشات منظور کی گئی ہیں اسے ایک بین الاقوامی معاہدے کی شکل میں اقوام متحدہ کے رکن ممالک سے منظور کرانے' ان پر عمل کرانے اور نتائج سے آگاہ کرنے کی کوششوں کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ یہ امر بھی بعید از قیاس نہیں کہ اب اقوام متحدہ صرف انہی ممالک کو معاشی' فنی اور مالی امداد دینے کی پابند ہو گی جو اپنی پالیسیوں کو اس معاہدے پر عملدرآمد سے مشروط کر دیں گے۔

پھر جون ۲۰۰۰ء میں بیجنگ پلس فائیو کانفرنس منعقد ہوئی جس میں یہودیوں کا خوفناک شیطانی منصوبہ پیش کیا گیا۔ یہاں دنیا کے مختلف ممالک کے ہم خیال شیطانی دماغ مل کر بیٹھے۔ ایک اہم بات ان کانفرنسوں سے متعلق یہ ہے کہ قاہرہ اور بیجنگ کا انتخاب محض اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ نہایت چالاکی سے تیار کی گئی اس سازش کے عین مطابق ہے جس کا مقصد اہل مصر سے ان مظالم کا بدلہ لینا ہے جو مصری فراعین نے بنی اسرائیل کے ساتھ روا رکھے تھے۔ وہ ان کی نرینہ اولاد اور مردوں کو قتل کر دیتے' تاکہ بنی اسرائیل کی آبادی ان کے لئے خطرہ نہ بن جائے اور عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تاکہ بنی اسرائیل میں جنسی انارکی پیدا کی جا سکے۔

> ''اور مصر میں ایک نیا بادشاہ اٹھا..... اُس نے اپنے لوگوں سے کہا دیکھو بنی اسرائیل کے لوگ ہم سے زیادہ اور قوی تر ہو گئے ہیں۔ آؤ ہم ان کے ساتھ چالاکی سے سلوک کریں تا نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ بڑھیں اور اُس وقت جنگ چھڑ جائے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل کر ہم سے لڑیں اور ملک سے نکل جائیں''۔ (خروج ۱:۸۔۱۱)
>
> ''تب مصر کے بادشاہ نے عبرانی عورتوں کی دائیوں سے جن میں ایک کا نام سِفرہ اور دوسری کا نام فُوعہ تھا' کلام کیا۔ اور کہا کہ عبرانی عورتوں کے لئے جب تم دائی کا کام کرو تو تم دیکھو کہ اگر لڑکا ہو تو اسے ہلاک کرو اور اگر لڑکی ہو تو اسے زندہ رہنے دو''۔ (خروج ۱:۱۵۔۱۶)

یاد رہے کہ مصر کی موجودہ فرعونی حکومت کے سرخیل' جمال عبدالناصر نے الاخوان المسلمون کی تحریک کو ختم کرنے کے لئے بڑے فخر کے ساتھ مصریوں کو یہ نعرہ دیا تھا: نحن ابناء الفراعنہ: یعنی ''ہم فرعونوں کی اولاد ہیں''۔ دوسری جانب بیجنگ اسی علاقے کے ساتھ واقع ہے جہاں عظیم الشان اسلامی ثقافت اپنی نمو کے لئے دورِ خوابیدگی (Dormant period) سے بیدار ہو رہی ہے۔ ذرا تصور کیجئے کہ پاکستان' افغانستان' ایران' ترکی' وسطی ایشیائی ریاستوں' ملائیشیا' انڈونیشیا اور خود ہندوستان و چین اور جنوبی ایشیا کے دیگر ممالک بنگلہ دیش' مالدیپ' سری لنکا' برما' فلپائن اور دیگر جزائر میں موجود ۸۰ تا ۸۵ کروڑ مسلمان ایک تحریک کی صورت میں اٹھ کھڑے ہوں تو دنیا کی سیاست کا نقشہ ہی تبدیل ہو کر رہ جائے گا۔ یہی وہ ''جہانِ نو'' ہے جس کی تشکیل سے شمال (امریکہ اور یورپی یونین) کی غاصب طاقتوں پر لرزہ طاری ہے' اور ان کی نیندیں حرام ہو چکی ہیں۔ صدیوں پر مشتمل استحصال' لوٹ مار' خود غرضی' منافقت اور مکاری پر مبنی نظام کو مزید توسیع دینے کی حرص میں مبتلا طاقتوں نے بیجنگ کا انتخاب بھی اسی لئے کیا ہے کہ جنوب (متذکرہ بالا اسلامی ممالک بشمول مشرق وسطیٰ) کی زرخیز زمین کو مکمل طور پر بانجھ بنا دیا جائے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ تہذیب جو تمام تر سائنسی ترقی کے باوجود فکری' اخلاقی اور ثقافتی طور پر تباہ و برباد ہونے کے بعد آخری ہچکی کا انتظار کر رہی ہے' دیگر تہذیبوں کو بھی اسی انارکی میں مبتلا کرنے کے درپے ہے۔ یہ وہ خوفناک حقیقت ہے کہ جس کی پیش بندی کرتے ہوئے Rene Guenon نے اپنی کتاب The Crisis of Modern World میں تحریر کیا تھا:

> ''مغرب کا غرقاب ہونا ایک امر لازمی بن چکا ہے' لیکن جب یہ غرق ہو گا تو اپنے ہمراہ پوری نوع انسانی کو بھی اپنے منتشر افکار و اعمال کے گرداب میں غرق کر دے گا۔''

موجودہ حالات میں کرنے کا اصل کام

یہاں ہم اپنے اعتراض کا حق محفوظ رکھتے ہوئے یہ عرض کریں گے کہ بلاشبہ منتشر مغربی افکار و اعمال جن کی بنیاد مخاصمت' منافقت' نفرت' احسان فراموشی' الحاد' سنگدلی' دروغ بافی' دہشت گردی' بددیانتی اور بے حسی سے مزین کی گئی ہے' مغرب کو غرق کر دینے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں اور ساتھ ہی ''نقال تہذیبوں'' کو بھی' لیکن وہ تہذیب جو ان مہلک جراثیم سے نہ صرف محفوظ ہو بلکہ متذکرہ بالا افکارِ خبیثانہ کے مقابلے میں بھرپور مدافعتی نظام کی بھی

حامل ہو' خود بھی ڈوبنے سے بچ سکتی ہے اور ڈوبتی ہوئی تہذیب کو بھی سہارا دینے کے قابل ہوتی ہے۔ لہٰذا قاہرہ اور بیجنگ کانفرنسوں کے حوالے سے اس بات کو نہایت اہمیت حاصل ہو گئی ہے کہ اسلامی تہذیب کو اس کی پوری توانائیوں کے ساتھ مغرب کے منتشر افکار و اعمال کے سامنے لایا جائے تاکہ نہ صرف ملتِ اسلامیہ بلکہ پوری نوعِ انسانی کو اُن مذموم اور نفرت انگیز افکار کی زہریلی فضا سے نجات دلائی جا سکے۔ ایسا اس لئے بھی ضروری ہو گیا ہے کہ وہ زندگی جس میں نہ ہی ایمان کی حرارت ہو اور نہ ہی اخلاقی ضوابط کی پیروی کا جذبہ' موت سے بدتر ہوتی ہے' اور یہی وہ اہم مسئلہ ہے جو ہماری (مسلمانوں کی) فوری توجہ چاہتا ہے۔

ایسے حالات میں ایک اچھی حکمت عملی اور پیش بندی کا تقاضا یہ ہے کہ فوری طور پر ایسے علمی و تحقیقی اداروں کا قیام عمل میں لایا جائے جو مختلف نظریات کی حامل تہذیبوں کی مذہبی اور سیاسی تاریخ کے ارتقاء پر تحقیقی کام کریں۔ ان اداروں میں تہاذیب کے عمرانی' معاشی' معاشرتی اور ادیانی اثرات کو بالخصوص تحقیق کا موضوع بنایا جائے۔ یہی وہ ادارے ہوں گے جو ایک نئی دنیا تخلیق کرنے کے ارتقائی عمل میں ممد و معاون ثابت ہوں گے اور ان اداروں سے وابستہ اہل علم نوعِ انسانی کو ایک نیا زاویۂ نگاہ عطا کرنے کے قابل ہوں گے۔ ایسا اس لئے بھی لازمی ہے کہ ہمارے سرکاری تعلیمی اداروں میں اگرچہ ڈگری سطح تک اسلامیات لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے لیکن ان اداروں سے نکلے ہوئے طالب علم نہ ہی جدید سائنسی علوم پر مہارت رکھتے ہیں اور نہ ہی انہیں اپنی جڑ بنیاد کے بارے میں صحیح علم ہوتا ہے۔ بے یقینی کی کیفیت میں پریشان حال فارغ التحصیل یہ طلبہ سوچ کے اعتبار سے منتشر اور فکر کے اعتبار سے بانجھ ہوتے ہیں۔ جہاں تک دینی تعلیم سے وابستہ اداروں کا تعلق ہے' یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ یہاں سے فارغ التحصیل طلبہ جدید سیاسی' معاشی' اقتصادی اور بین الاقوامی تعلقات کے حوالے سے قطعی نابلد ہوتے ہیں' لہٰذا عصر حاضر کے حوالے سے یہ دیگر نظریات کے مقابل اسلامی نظریات و عقائد کو تقابلی انداز میں نہ ہی بیان کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی وضاحت کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ چنانچہ فوری طور پر ایسی منظم مہم کی ضرورت ہے جو ان تعلیمی اداروں میں زندگی کی نئی روح پھونک دے اور ہمارے دینی ادارے مشنری تعلیمی اداروں سے زیادہ مثبت نتائج پیدا کر سکیں۔ اگر یہ ممکن ہو جائے تو ہم طلبہ کی ایسی کھیپ تیار کرنے کے قابل ہو سکیں گے جو نوعِ انسانی کے باطنی اضطراب کو جان کر اور فلسفہ و سائنس کے میدانوں میں اُتر کر اس خلا کو پُر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو گی جو اخلاقی اور مذہبی اقدار

کے نہ ہونے کے باعث وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

موجودہ حالات میں ملتِ بیضا کا خوابِ غفلت سے جاگنا ایک ناگزیر ضرورت بن چکا ہے' کیونکہ مغرب کے پراگندہ افکارات نے اس سے قبل اہل یورپ کی زندگیوں پر بھی تباہ کن اثرات مرتب کئے تھے۔لیکن اب ڈیل اولیری (بیجنگ ڈاکیومنٹ کی مؤلفہ)' امریکی پیشہ ور طوائفوں کی نمائندہ نورما الموڈووار (Norma Almodovar) اور ہم جنس پرست خواتین کی نمائندوں جیسی انتہا پسند اور اخلاقی گراوٹ میں مبتلا خواتین کے افکار سے پوری نوعِ انسانی کو مہیب خطرہ لاحق ہو چکا ہے۔اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم سے ان خواتین نے جو سفارشات مرتب کی ہیں' انسانی معاشرے میں ان کے نفاذ کے ہولناک نتائج برآمد ہوں گے' لہٰذا اگر فوری طور پر اس کا تدارک نہ کیا گیا تو پوری نوعِ انسانی شیطانی افکار کی پرستش کرتے کرتے اپنی موت آپ مر جائے گی۔

بیجنگ کانفرنس کی مرتب کردہ سفارشات جن پر اقوام متحدہ کے ذریعے عمل کرایا جانا ہے' ان کے بارے میں بہت کچھ تحریر کیا جا چکا ہے' لیکن ہم جن قابل اعتراض نکات کو اپنی بحث کا محور بنانا چاہتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

☆ خواتین کی آزادی کی راہ میں مذہب کو سب سے بڑی رکاوٹ قرار دے کر مذہبی پابندیوں اور مروّجہ قوانین کو تبدیل کرنے کی جانب پیش قدمی کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔

☆ ہم جنس پرستی' جسم فروشی اور آزادانہ جنسی تعلقات کو حق (right) قرار دے کر عائلی زندگی اختیار کرنے کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔

☆ بچے کی پیدائش کے بارے میں فیصلے کا قطعی حق خواتین کو دینے کی سفارش کی گئی ہے۔

☆ دستیاب روزگار کا نصف خواتین کو دینے کی سفارش اس دلیل پر کی گئی ہے کہ طبعی و جسمانی لحاظ سے مرد اور عورت برابر ہیں۔

بیجنگ کانفرنس کی سفارشات کی حدت کو اگرچہ الفاظ و اصطلاحات سے ملمع زدہ کر کے کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے' لیکن اس کا اصل لبِ لباب یہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔شاید آپ اسے تسلیم نہ کریں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اہل مغرب اپنی تہذیب کے ہاتھوں اس قدر تنگ آ چکے ہیں کہ وہ اپنی دنیا کو خود اپنے ہاتھوں سے ختم کرنے کے درپے ہیں۔انہوں نے اپنے مسائل کو حل کرنے کے لئے کئی جتن آزمائے۔مذہب (عیسائیت) کے خلاف بغاوت کی' مادہ

پرستی کی دنیا تخلیق کی' پھر ایک ازم کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا ازم پیش کرتے رہے' لیکن نجات کی صورت نہ پا کر اب خود تو غرقاب ہو ہی رہے ہیں' ساتھ ہی دیگر اقوام کو بھی غرقاب کرنے کے درپے ہیں۔ یہ اپنے پھیلائے ہوئے فتنوں اور فساد کو پوری دنیا پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ انسانوں کی پوری تاریخ میں اس قسم کا دور کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ نوع انسانی ایک ایسے دوراہے پر کھڑی ہے جہاں ایک قدم بھی غلط سمت میں پڑ گیا تو وہ اسے فنا کر کے رکھ دے گا۔ نوع انسانی کی طویل تاریخ میں کئی حوادث ظہور پذیر ہوئے ہیں' لیکن اخلاقی گراوٹ کو عالمگیر بنانے کا یہ فیصلہ نہ صرف پریشان کن ہے بلکہ وسعتوں اور پہنائیوں کے لحاظ سے بھی پچھلے تمام حوادث سے پیچیدہ اور ظلمت کے اعتبار سے سیاہ ترین ہے۔ پہلے حوادث خاص خطوں میں رونما ہوا کرتے تھے اور ان کے اثرات بھی کسی مخصوص جغرافیائی حدود تک محدود رہتے تھے' لیکن اب پوری نوع انسانی اس حادثے کا شکار ہونے کو ہے۔ اس سے قبل شر کی قوتیں کبھی اتنی منظم اور زور آور نہیں ہوئی تھیں۔ لہٰذا جو مصیبت ہمارے سامنے ہے اس کے متعلق ہمیں کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔ اخلاقی اقدار کی زبوں حالی و شکست کا اندوہناک احساس اگر ہم نے اب بھی نہ کیا اور زندگی کی شکستہ عمارت کو از سر نو محکم بنیادوں پر استوار کرنے کی کوششیں صدقِ دل کے ساتھ نہ شروع کیں تو ہماری تقدیر ہر آنے والے دن کے ساتھ بد سے بدتر ہوتی چلی جائے گی۔ کیا ملت بیضا اس قدر ناسمجھ اور کم فہم ہے کہ زہر ہلاہل کو تریاق سمجھ کر پی جائے گی اور مغرب کے ہلاکت انگیز افکار سے اپنے پاکیزہ معاشرے کو جہنم زار بنا ڈالے گی؟

آج ہم اہلِ مشرق اور بالخصوص مسلمان مغرب کے افکار' اس کے تمدن اور تہذیب کو بدتر جان کر بھی اندھا دھند اپنے اُوپر مسلط کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ہمارا احساسِ کمتری ہمیں دنیا بھر میں رسوا کر رہا ہے۔ دنیا کا کون سا ایسا خطہ ہے جہاں مسلمان اہل مغرب یا اُن کے ایجنٹوں کے ہاتھوں مار نہیں کھا رہے؟ نسل کشی کی جا رہی ہے تو مسلمانوں کی' علاقوں پر قبضے کئے جا رہے ہیں تو مسلمانوں کے' پیداواری اشیاء اونے پونے داموں فروخت کرنے پر مجبور کئے جا رہے ہیں تو مسلمان اور ''بدتہذیب'' قبول کرنے پر مجبور کئے جا رہے ہیں تو مسلمان۔ ہمارا احساسِ کمتری اپنی جگہ لیکن خود اپنی تہذیب کے بارے میں مغربی مفکرین کیا کہتے ہیں' اسے جاننے کے لئے لارڈ اسنل کی کتاب ''The New World'' ینگ کی کتاب ''Modern man in search of soul'' اور ڈین ایچ کی کتاب ''The

Fall of Idols'' اہلِ ذوق کے لئے معلومات کا خزانہ ثابت ہوسکتی ہیں۔ان کتب سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی مفکرین نے اپنے مسائل کے حل کے لئے جب مذہب سے رجوع کیا تو انہیں سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔اس لئے کہ انہیں جس قسم کا مذہب عیسائیت کی شکل میں ملتا رہا وہ زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے بجائے اور زیادہ پیچیدہ بنا دیتا ہے۔چنانچہ وہائیٹ ہیڈ اپنی کتاب ''Adventure of Ideas'' میں تحریر کرتا ہے:

''اناجیل اربعہ میں جس قسم کا اخلاقی ضابطہ دیا گیا ہے اسے اگر عصر حاضر کے معاشرے میں رائج کر دیا جائے تو فوری موت کے سوا اس کا نتیجہ کچھ اور نہ ہوگا۔''

مغربی مفکرین کے لئے سب سے بڑی مشکل یہ رہی کہ انہوں نے یہ سمجھا کہ دنیا میں جہاں جہاں مذہب کا نام لیا جاتا ہے وہ یا تو عیسائیت سے کم درجے کا ہے یا پھر اسی طرح کا جس کا ذکر کرتے ہوئے Emery Reves نے تحریر کیا تھا:

''ہمیں یہ بات تسلیم کر لینی چاہئے کہ ہمارا مذہب (عیسائیت) قلبِ انسانی کی کیفیات سمجھنے میں بری طرح ناکام رہا ہے۔اس نے تہذیب و اخلاق کا جو تانا بانا بُنا تھا' آج کے معاشرتی مسائل نے اسے تار تار کر دیا ہے۔''

بیجنگ کانفرنس میں مذہب کی مخالفت اور الحادی تعلیمات کے فروغ کی کوشش کے پسِ پشت مغربی خواتین کی یہی مشکل تھی کہ انہوں نے مذہب کو صرف عیسائیت کے حوالے سے دیکھا جس نے عورت کو چہار جانب سے ایسے مصائب و مشکلات میں گرفتار کر رکھا ہے کہ ان کی زندگی جیتے جی جہنم بن چکی ہے۔ان خواتین نے اپنے آپ کو جب اس ظلمت میں گھرا پایا اور نکلنے کی کوئی راہ نہ پائی تو اپنی نجات کے لئے مذہب سے گریز اور فرار اختیار کر کے مادر پدر آزادی کا اعلان کر دیا۔مغربی خواتین کی مذہب بیزاری کی وجہ یہ ہے کہ ان کی تہذیب جس مذہب کے ردعمل کے طور پر پروان چڑھی وہ ڈورسی کے مطابق شکست خوردوں کا مذہب ہے۔وہ اپنی کتاب ''تہذیب'' (Civilization) میں تحریر کرتا ہے:

''جو لوگ اس مذہب کی قبولیت سے اعترافِ شکست کرتے ہیں وہ سچے ہیں' اس لئے کہ یہاں خواہشات کی تکمیل گناہ ہے۔سوچ کا یہ انداز صحت مند زندگی کو روگ بنا دیتا ہے۔اس سے انسانیت برباد ہو کر رہ جاتی ہے۔''

مشہور مفکر نیٹشے اسی ضمن میں تحریر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

''انسانی خودی کو جتنے گہرے زخم عیسائیت نے لگائے ہیں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔اس مذہب نے بڑے بڑے ذہین اور تخلیقی انسانوں کو برباد کر کے رکھ دیا

ہے۔''(NEITSCHI By M.A Magay)

مسیحیت کی انہی انسان کش تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ مارٹن لوتھر اور عقلیت پسندوں نے عیسائیت کے ایک ایک عقیدے کو اپنی کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔ رہی سہی کسر وولٹائر نے ملحدانہ تحریک چلا کر پوری کر دی' اور اس تحریک نے بعد ازاں براعظم یورپ میں ایسی تحریکوں کو جنم دیا جن سے انسانیت کا دامن بار ہا تار تار ہوا۔ فاشزم' نازی ازم' کمیونزم' مورمونزم' شیطان ازم' گے ازم اور لسبین ازم وغیرہ ایسی تحاریک ہیں جو یورپ ہی میں پروان چڑھیں اور جن کے باعث مغربی معاشرہ گوناگوں وحشت انگیز مصائب کا مسکن بنتا رہا ہے۔ یہ تمام تحریکیں ان تمام مذموم افعال اور نفرت انگیز اعمال کا مادی مظاہرہ ہیں جو مسیحیت نے یورپی معاشرے کو عطا کئے تھے۔ ان تحریکوں کے باعث اہل یورپ نے جو مجرمانہ حماقتیں' منافقتیں' تہمت تراشیاں' دروغ بافیاں' سنگدلانہ حرکات' وحشت انگیز تصوراتی لذائذ غرض پورے کا پورا پاگل پن دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اس کے انسانیت سوز شعلے نہ صرف اہل مغرب کی تہذیب کو جلا کر خاکستر کر رہے ہیں بلکہ ان کی تپش سے دیگر تہذیبیں بھی خطرے سے دوچار ہو چکی ہیں۔

جہاں تک تحریکِ نسواں کا تعلق ہے' اپنی فطرت کے اعتبار سے یہ یورپ کی سرزمین سے نمو پانے والی خطرناک ترین تحریکوں میں سب سے بازی لے گئی ہے۔ خاندان اور پاکیزہ معاشرے کے ستونوں کو لرزا دینے والی یہ تحریک کس پس منظر میں پروان چڑھی؟ اور اس کے منطقی نتائج کیا ہوں گے؟ یہ وہ دو سوالات ہیں جو ہمارا اصل موضوع ہیں اور انہی سوالوں کے جوابات نوع انسانی کو ایسی کامیاب حکمت عملی وضع کرنے میں مدد دے سکتے ہیں جو مثالی تمدن اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی مکمل حفاظت اور نمو کی ضامن بن سکنے کی قابلیت رکھتی ہو۔

عیسائیت میں عورت کا مقام

چونکہ سرزمین یورپ سے اٹھنے والی تمام تحریکیں مذہب کے ردِّعمل کے طور پر پروان چڑھیں اس لئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ تحریکِ نسواں کے حوالے سے ہم ان کے مذہب (عیسائیت) میں خواتین کے مقام کو تلاش کرنے کی سعی کریں تاکہ ردِّعمل کے حقیقی اسباب کا صحیح معنوں میں تعین کیا جا سکے۔ خواتین سے متعلق یوں تو پوری بائبل میں بے شمار حوالے تلاش کئے جا سکتے ہیں لیکن عہد نامہ قدیم کے غیر مستعمل ہو جانے کے باعث عہد نامہ جدید میں موجود اناجیل اربعہ اور دیگر خطوط سے چند حوالے پیش خدمت ہیں:

انجیل متی، باب ۱۹

☆ پر میں تم سے کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی بیوی کو حرام کاری کے سوا کسی اور وجہ سے چھوڑ دے اور دوسری سے بیاہ کرے، زنا کرتا ہے، اور جو کوئی اس چھوڑی ہوئی کو بیاہے، زنا کرتا ہے۔ (آیت ۹)

☆ شاگردوں نے اس سے کہا کہ اگر مرد کا بیوی کے ساتھ ایسا ہی حال ہے تو بیاہ کرنا ہی اچھا نہیں۔ (آیت ۱۵)

☆ اُس نے ان سے کہا کہ یہ بات سب کی سمجھ میں نہیں آتی مگر ان کو جن کو دیا گیا ہے۔ (آیت ۱۱)

☆ بعض تو خوجے ہیں جو ماں کے بطن ہی سے ایسے پیدا ہوئے اور بعض خوجے ہیں جنہیں آدمیوں نے خوجہ بنایا اور بعض خوجے ہیں جنہوں نے آسمان کی بادشاہی کے لئے اپنے آپ کو خوجہ بنایا، جو سمجھ سکے وہ سمجھ لے۔ (آیت ۱۲)

متی، باب ۲۴

☆ ان پر افسوس جو ان دنوں میں حاملہ ہوں اور جو دودھ پلانے والی ہوں۔ (آیت ۱۹)

لوقا، باب ۲۳

☆ یسوع نے ان کی طرف مڑ کر کہا: اے یروشلم کی بیٹیو! مجھ پر نہ روؤ بلکہ اپنے آپ پر روؤ اور اپنے بچوں پر۔ کیونکہ دیکھو وہ دن آئیں گے جن میں کہیں گے مبارک ہیں بانجھیں اور وہ رحم جو بار ور نہ ہوئے اور وہ چھاتیاں جنہوں نے دودھ نہ پلایا۔ (آیت ۲۷، ۲۸)

۱۔ اقرنتیون، باب ۷

☆ سو مرد کے لئے اچھا ہے کہ عورت کو نہ چھوئے۔ (آیت ۱)

☆ پس میں بے بیاہوں اور بیواؤں سے یہ کہتا ہوں کہ ان کے لئے اچھا ہے کہ جیسا میں ہوں ویسے ہی رہیں، لیکن اگر خود ضبطی ان سے نہ ہو سکے تو بیاہ کریں کیونکہ بیاہ کرنا جل جانے سے بہتر ہے۔ (آیت ۷ تا ۹)

☆ .....کیا تُو بیوی کے بند سے آزاد ہے؟ بیوی کی تلاش نہ کر۔ (آیت ۲۷)

☆ مگر ایسے لوگ (جو بیاہ کرتے ہیں) جسمانی تکلیف میں مبتلا ہوں گے اور میں تو تمہیں بچانا چاہتا ہوں۔ (آیت ۲۸)

☆ لیکن اے بھائیو! میں یہ کہتا ہوں کہ وقت تنگ ہے، آگے کو چاہئے کہ جن کی بیویاں ہیں وہ ایسے ہوں گویا ان کے بیویاں نہیں۔ (آیت ۲۹)

☆اور میں یہ چاہتا ہوں کہ تم بے فکر رہو۔ بے بیاہا خداوند کے لئے فکر مند رہتا ہے کہ کس طرح خداوند کو خوش کرے۔ (آیت ۳۲)

☆مگر بیاہا ہوا دنیا کیلئے فکر مند رہتا ہے کہ کس طرح اپنی بیوی کو خوش کرے۔ (آیت ۳۳)

☆اور وہ دو طرفہ ہے۔ اسی طرح بے بیاہی اور کنواری ان باتوں کی فکر میں رہتی ہے جو خداوند کی ہیں، یعنی کہ وہ بدن اور روح دونوں کی نسبت پاک ہو، مگر بیاہی ہوئی ان باتوں کی فکر میں رہتی ہے جو دنیا کی ہیں، یعنی یہ کہ کس طرح اپنے شوہر کو خوش کرے۔ اور وہ اپنے دل میں یہ ٹھانے کہ میں اپنی لڑکی کو کنواری رہنے دوں گا تو وہ اچھا کرتا ہے۔ غرض جو اپنی کنواری لڑکی کو بیاہ دیتا ہے وہ اچھا کرتا ہے اور جو بیاہ نہیں دیتا وہ بہتر کرتا ہے۔ (آیت ۳۴)

☆مگر جیسی ہے اگر وہ ویسی ہی رہے (بیوہ ہو جائے تو شادی نہ کرے) تو میری رائے میں وہ زیادہ خوش نصیب ہے۔ (آیت ۴۰)

غلاطیون، باب ۵

☆ اور جو مسیح یسوع کے ہیں انہوں نے اپنے جسم کو اس کی رغبتوں اور خواہشوں سمیت مصلوب کر دیا ہے۔ (آیت ۲۴)

''عورت: آدم کے ازلی گناہ کی ذمہ دار''

جناب یسوعؑ سے منسوب اور خود ساختہ رسول ''پال'' کے ان ارشاداتِ عالیہ کی روشنی میں یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ عیسائیت میں عورت کی حیثیت ایک ایسی قابل نفرین شے کی ہے جو مَردوں کو خدا کے راستے پر چلنے سے بھٹکا دیتی ہے۔ اگر بائبل کی شروعات ہی کو دیکھا جائے تو ہمیں وہاں یہ تعلیم نظر آئے گی کہ جنت میں مرد کو ورغلانے کے لئے عورت نے اپنی نسوانیت کا سہارا لیا اور اسے بالآخر جنت سے نکال کر ہی دم لیا۔ وہ ایک ایسا زہریلا سانپ ثابت ہوئی جس نے مرد کی پاکبازی کو ڈس کر اسے خدا سے دور کر دیا یعنی مرد جب تک عورت سے نا آشنا تھا، معصوم تھا، لیکن جب عورت نے اسے آلودہ کر دیا تو وہ گناہ گار بن گیا۔ دنیائے عیسائیت اسے ازلی گناہ سے تعبیر کرتی ہے اور یہ عقیدہ بقول دانیال ولسن عیسائی مذہب کی جان ہے (Daniel Wilson: Evidences of Chiristianity)۔ عالم عیسائیت اس ازلی گناہ کی ذمہ داری عورت پر عائد کرتا ہے۔ چنانچہ سینٹ آگسٹائن اس بارے میں فرماتے ہیں:

''کہنے کو یہ معمولی گناہ تھا لیکن اپنی کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے نہایت سنگین تھا' اس لئے کہ یہ انسان کا پہلا گناہ تھا جس سے انسان شہوت سے آشنا ہوا اور اس طرح بہت سے گناہوں میں شامل ہوتا گیا' لہٰذا یہ گناہ گناہوں کے مجموعے کی اصل بنیاد بن گیا۔ اس گناہ کے ذریعے انسان نے اپنے آپ کو ''موت'' کا مستحق بنالیا۔''

(St.Augustine:The City of God, vol.14, chap.12, p.257)

سینٹ آگسٹائن مزید فرماتے ہیں:

''سچی بات تو یہ ہے کہ جس گناہ کی بھی حقیقت پر آپ نظر ڈالیں گے' اس کا عکس اس ایک گناہ (ازلی گناہ) میں آپ کو ضرور نظر آئے گا۔''

(St.Augustine:The Euchiridion xlv p.684, vol.1)

عیسائی عقیدے کے مطابق اس گناہ کے بعد جس کی ترغیب عورت نے دی تھی اور جس کے نتیجے میں مَردوں کو اپنی جنسی قوت کا علم ہوا تھا نیکی کی قوت سلب کر لی گئی' خدا نے اپنی رحمت انسان سے اٹھالی اور اس رحمت کے اٹھنے کے ساتھ انسان کی سرشت میں گناہ کا عنصر شامل ہو گیا اور وہ اس ایک گناہ کے ذریعے سے بے شمار گناہوں میں مبتلا ہو گیا۔ چونکہ عورت اس سارے عمل میں اصل قصوروار تھی لہٰذا عورت سے نفرت' بغض اور تعصب بھی گناہوں کے ساتھ ساتھ عیسائی مَردوں کی سرشت میں داخل ہو گیا' حتیٰ کہ سینٹ آگسٹائن جیسے عالم و فاضل شخص نے بھی ''حوا'' سے اس قدر تعصب برتا کہ ان کا نام تک لینا گوارا نہ کیا۔ وہ فرماتے ہیں:

''وہ تمام انسان جو آدم اور ''اُس عورت'' سے پیدا ہوئے جس نے آدم کو گناہ میں مبتلا کیا تھا اور جو آدم کے ساتھ سزا یافتہ تھی' اصلی گناہ (Original Sin) سے داغدار ہو گئے۔'' (The Euchiridion xxvi Britannica p.633 vol.4)

سینٹ آگسٹائن نے جس خاتون کو ''اُس عورت'' کے الفاظ سے نوازا ہے' بائبل کے مطابق اسی عورت نے حضرت آدمؑ کو گناہ میں مبتلا کیا تو خدا کو اس امر پر شدید ناراضگی ہوئی' چنانچہ اس نے مرد کو ورغلانے کی سزا دیتے ہوئے عورت کو اس طرح مخاطب کیا:

''میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھاؤں گا' تو درد ہی کے ساتھ اولاد جنے گی' تو اپنے شوہر کے اختیار میں رہے گی' تجھ پر وہ حکومت کرے گا۔'' (تکوین باب ۳:۱۶)

اور جناب آدمؑ کو' جو ''اُس عورت'' کے ورغلانے میں آ گئے تھے اور اپنی عریانی ظاہر ہو گئی تھی' کہا کہ:

''زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی''۔ (تکوین باب ۳:۱۷)

بائبل کی تعلیمات کے سبب سینٹ آگسٹائن' جان کالون اور تھامس ایکویناس جیسے کلیسائی بزرگوں نے انسان کے ازلی گناہ کا ذمہ دار عورت کو قرار دیتے ہوئے جتنے بھی نظریات کی آبیاری کی ان تمام میں عورت کو ایک غلیظ اور مکروہ شے قرار دیتے ہوئے اس سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ نفرت و بغض کا یہ عالم تھا کہ وہ عقیدہ جس میں بپتسمہ سے قبل مر جانے والے بچوں کو سماوی بادشاہت میں داخلے کے قابل نہیں سمجھا گیا' اس کی ذمہ داری بھی عورت پر ڈال دی گئی ہے۔ اس کی وضاحت ہم اس طرح کریں گے کہ عیسائیت کے بنیادی اصول کے مطابق انسانی فطرت میں شر موروثی طور پر منتقل ہو گیا ہے' لہٰذا آدم اور ''اُس عورت'' کے ازلی گناہ کے نتیجے میں اب ہر انسان بری طینیت کا واقع ہوا ہے۔ عیسائیت کے مطابق اس ''شر'' کا علاج جناب یسوعؑ کی الوہیت پر ایمان لانے ہی سے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ سینٹ ایکویناس تحریر کرتے ہیں:

''جو بچے بپتسمہ لینے سے قبل مر گئے ان میں چونکہ اصلی گناہ برقرار ہے اس لئے وہ کبھی خداوند کی بادشاہت نہیں دیکھیں گے۔''

(Acquinas, The Summa Theologica 875, p. 714)

غرض کہ عورت کی وساطت سے ظہور پذیر ہونے والے ازلی گناہ کے عقیدے سے معصوم بچے بھی بادشاہتِ خداوندی میں داخلے سے محروم ہیں۔

ازلی گناہ کے عقیدے پر اہل مغرب کی پشیمانی

لیکن اب خود یورپی مفکرین اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ ازلی و فطری گناہگاری کا عقیدہ ایک باطل اور ہزارہا خرابیوں کا موجب عقیدہ ہے' چنانچہ سر ہنری جونز نے اپنی کتاب "The Faith that Enquires" میں اس عقیدے کی تردید کرنے کے بعد یہ تحریر کیا کہ انسان نیک فطرت ہوتا ہے۔ اسی طرح "Confucianism and Modern China" کا مصنف R.F.Johnson تحریر کرتا ہے:

''ازلی گناہ کا عقیدہ درحقیقت ازلی خرابی ہے جس کی وجہ سے ہم ہر قسم کے خیر سے بیزار اور ہر قسم کے شر کی جانب مائل رہتے ہیں۔''

"Character and the Conduct of Life" نے اپنی کتاب William McDougall میں کم و بیش انہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ تحریر کرتا ہے:

''اب عصر حاضر کے بچے کی عزت نفس کو اس عقیدے سے مجروح نہیں کیا جاتا کہ وہ

فطری طور پر ''بد'' ہے' اب اس کی تربیت کے دوران اس بات کا مسلسل اعادہ کیا جاتا ہے کہ وہ فطرتاً نیک ہے۔''

مغربی مفکرین کے اس نتیجہ پر پہنچنے سے بہت قبل جبکہ عیسائیت شر اور بدی کو انسانی فطرت میں مستقل طور پر شامل قرار دے چکی تھی' اسلام نے اعلان کر دیا تھا کہ ہر انسانی بچہ نیک فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ ایک حدیث نبویؐ صراحتاً اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ ہر بچہ نیک فطرت پر پیدا ہوتا ہے' وہ گناہ سے پاک اور معصوم ہوتا ہے' بعد ازاں اس کے والدین' ماحول' صحبت اور تربیت اسے اچھے یا برے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔

آپ لمحہ بھر کے لئے ایسے انسان کا تصور کریں جس کے لاشعور میں بچپن ہی سے یہ بات ذہن نشین کرا دی گئی ہو کہ وہ فطرتاً بد واقع ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص شر کی طرف مائل ہونے میں ذرا بھی تامل محسوس نہیں کرے گا۔ وہ شخص اگر لوگوں کی جان' مال' عزت اور آبرو سے کھیلتا رہے اور جب اسے عدلیہ کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ یہ کہہ دے کہ جج صاحب! میں کیا کرتا' میں تو مجبور تھا' میری تو فطرت ہی بد ہے اور گناہ میری میراث ہے۔ جج صاحب اس کا یہ استدلال سن کر فرمائیں کہ کچھ بھی ہو تم ہو تو گناہگار' تم نے لوگوں کو قتل کیا' خواتین کی آبروریزی کی' لوگوں کا مال و اسباب لوٹا' اس کی سزا تو تم کو ضرور ملے گی۔ اور اس پر مجرم کہے کہ جج صاحب! میں تو جناب یسوع کی الوہیت پر ایمان رکھتا ہوں کہ وہ خدا کے بیٹے ہیں اور میں یہ بھی ایمان رکھتا ہوں کہ خدا کی ذات کے اقنوم کے دوسرے حصے خداوند یسوع مسیح نے مصلوب ہو کر اگلے پچھلے تمام گناہگاروں کے گناہ معاف کر دیئے ہیں' لہٰذا میری معصومیت تو ثابت ہو چکی' اب ازراہِ کرم میری رہائی کے احکامات صادر فرمایئے۔ اور جب سارے معاشرے کی سوچ ہی ایسی ہو تو اس معاشرے کا کیا حال ہوگا! یورپ کی عیسائی حکومتوں نے عدالتی نظام اور ادارے بنا کر عملی طور پر اس عقیدے پر کاری ضرب لگا دی ہے' تاہم سنگین جرائم پر بھی معمولی سزائیں دینا اور قاتلوں و بدکاروں سے ہمدردی ان کا معمول اسی لئے ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان فطری طور پر ''بد'' ہے' چنانچہ شر کے افعال سرزد ہونے پر اس کا قصور ہے ہی نہیں۔

ظاہر ہے کہ کوئی بھی عاقل شخص فطرتِ انسانی پر لگائی گئی ایسی مضحکہ خیز تہمت پر ایمان لا ہی نہیں سکتا کہ انسان ازلی طور پر گناہگار ہے۔ عیسائیت نے نہ صرف یہ تہمت لگا کر انسانی شخصیت کو ریزہ ریزہ کر دیا بلکہ ازلی گناہ کی اصل ذمہ داری عورت پر ڈال کر اسے ذلیل ترین

مخلوق کا درجہ بھی عنایت کر دیا۔ لیکن کذب پر مبنی پروپیگنڈے کا کمال ملاحظہ فرمائیے کہ عورت کو تمام برائیوں کی جڑ قرار دینے والی عیسائیت آج عورت کے حقوق کی سب سے بڑی محافظ بنی بیٹھی ہے۔ عیسائیت نے عقائد اور عملی اعتبار سے عورت کی شخصیت کو جھلسا دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن کلیسائی سحر میں گرفتار نادان عیسائی اور مغرب سے مرعوب ناسمجھ ایشیائی وافریقی باشندے یہ خیال کرتے ہیں کہ مغرب نے عورت کو تحفظ فراہم کرنے اور معاشرے میں اس کا مقام بلند کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔

خواتین کے بارے میں اہل مغرب کا رویہ جاننا ہو تو آپ ان کے ادب، مصوری، مجسمہ سازی اور دیگر فنونِ لطیفہ کو ذرا تفصیل میں ملاحظہ فرمائیں۔ بعض جگہ تو صرف سرسری نظر ڈالنے پر ہی آپ کو اہل مغرب کے خواتین کے لئے روا رکھے جانے والے رویوں کو ملاحظہ فرما کر کراہت آنے لگے گی۔ اس حقیقت سے کون آشنا نہیں ہے کہ مغربی ادب خواتین کے لئے فحش گوئی اور غلیظ زبان سے مالا مال ہے۔ ان کی صحافت ہو یا ابلاغ عامہ کا کوئی ادارہ، ان اقوام کا فن عروج ہی وہاں پاتا ہے جہاں عورت کا برہنہ بدن مختلف زاویوں سے مَردوں کی تسکینِ ہوس کا سامان فراہم کرتا ہو۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کی چودہ شاندار صدیاں اس بات کی شاہد ہیں کہ اُس زمانے میں بھی جب عورت کی حیثیت محض ایک جانور کی سی تھی، اسے نہ صرف بطور شخصیت قبول کیا گیا بلکہ حقوق وفرائض میں بھی شریک کیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ خواتین کا احترام ایمان کی سلامتی کا جزو لاینفک بنا کر انہیں عزت کا وہ اعلیٰ منصب دیا گیا جس کا تصور عصر حاضر کی مغربی اور مغرب زدہ خواتین کے حیطہ سوچ سے بہت آگے ہے۔ آپ مسلمانوں کے قدیم وجدید ادبی رجحانات پر نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ مسلم ادیبوں نے خواتین کے لئے فحش گوئی کا کبھی استعمال نہیں کیا، بلکہ کائنات کے حسن میں ان کے وجود کو لازم قرار دینا اور ان کے لئے خوبصورت الفاظ واستعارات کا استعمال صرف مسلمانوں کی تہذیب ہی کا ورثہ ہے۔ خواتین کا ذکر کرتے وقت مسلمان ادیبوں، شاعروں اور فلاسفہ نے ہمیشہ حسینی کلمات کا بدرجہ حد ادب اہتمام کیا اور انہیں بحیثیت انسان ایک مکمل شخصیت کے روپ میں پیش کیا۔

ازدواجی تعلقات کے لئے قرآن کا خوبصورت استعارہ

انسانی قلم سے تحریر کئے گئے الفاظ اگر ہم ایک جانب رکھ دیں اور ان کتب کا مطالعہ کریں جنہیں ان کے پیروکار الہامی گردانتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ بائبل میں بیشتر جگہوں پر

خواتین کے لئے اس قدر شرمناک الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور پاکیزہ انسانی رشتوں کو اس قدر آلودہ کیا گیا ہے کہ برنارڈ شا جیسے مشاہیر مغرب بھی یہ بات کہنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ اس کتاب (بائبل) کو بچوں کی پہنچ سے دور رکھنا چاہئے' ایسا نہ ہو کہ وہ اس میں موجود فحش کہانیاں پڑھ کر انسانی رشتوں کا احترام ہی کھو بیٹھیں ـــــ جبکہ جمالیاتی و ادبی اعتبار سے قرآن مجید کی آیت ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ اس قدر معنی آفرین اور خوبصورتی کے اعتبار سے اتنی اعلیٰ و ارفع ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے ادیب تو کجا اپنے تئیں الہامی کتب کے وارث بھی اپنی ان کتابوں سے اس کے مقابلے کا ایک جملہ بھی پیش نہیں کر سکتے۔ اس مقام پر لباس کے استعارے کا استعمال اس قدر برمحل اور خوبصورت ہے کہ اہل ذوق اس کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لباس ہمیں تحفظ فراہم کرتا ہے۔ خوبصورتی' رعنائی اور دلکشی فراہم کرتا ہے۔ انسانی رعنائی کو اگر لباس کے دائرے سے باہر کر دیا جائے تو یہ ہزار ہا خرابیوں کا موجب ہے اور جب انسان کی خوبصورتی کو خوبصورت لباس سے مزین کیا جائے اور اسے اخلاقی رشتوں تک ہی محدود رکھا جائے تو یہ حسن و محبت کا ایسا دلنشیں اظہار بن جاتی ہے جو مرد اور مرد کے مابین یا عورت اور عورت کے مابین ناقابل تصور ہے۔ خالقِ کائنات کی عطا کردہ نعمتوں میں سے رفاقت کی یہ بے مثل نعمت اور اس کی دلکشی مرد اور عورت کے لئے ایسا آسمانی انعام ہے جس سے عیسائی مغرب کے مشاہرین تاحال ناواقف ہیں۔ لیکن ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیں کہ وہ مذہب جس کی بنیاد ہی خواتین سے بغض و عناد پر رکھی گئی ہے اور جس نے مذہب کی حفاظت کے نام پر خواتین کو طویل عرصے تک زندہ جلایا ہے' اس مذہب کے پیروکار اسلام پر بڑھ چڑھ کر تنقید کرتے ہیں۔ مذہب عیسائیت کا علمبردار ''مغرب'' جس نے عورت کی عفت و عصمت کو محض اپنی تسکینِ ہوس کا سامان بنا رکھا ہے' دین اسلام جیسے مطہر دین کو تہذیب و تمدن سے عاری گردانتا ہے۔ نظریاتی طور پر اہل مغرب یہ ایمان رکھتے ہیں کہ راہبانہ زندگی سب سے اَرفع نیکی اور ماحاصلِ اخلاقیات ہے لیکن عملی طور پر انہوں نے زندگی کے اس شعبے میں وہ ترقی کی ہے کہ جانور بھی ان سے شرمانے لگے ہیں۔ اس کے باوجود ان کے کمالِ ہنر کی داد دیجئے کہ وہ کس قدر شوخی کے ساتھ زہر ہلاہل کو قند بنا کر اقوامِ عالم کے سامنے پیش کرتے ہیں:

چہ دلاور است دُزدے کہ بکف چراغ دارد!

''چور بھی کس قدر سینہ زور ہے کہ چراغ ہتھیلی پر لئے چوری کرنے نکلا ہے!''

عیسائیت کی تعلیمات اور متجر دانہ زندگی

خواتین کے حقوق کے تحفظ کے داعی اہل مغرب کی اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کے نزدیک عورت ایسی حقیر و ذلیل مخلوق اور وہ برائی ہے جو خدا کی راہ میں حائل ہو کر مَردوں کو اصل راستے سے بھٹکا دیتی ہے۔ گویا خدا کو صرف ایسے مَردوں کی ضرورت ہے جو حیاتیاتی لذائذ، رعنائیوں اور خوشیوں سے نفرت کرتے ہوں۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر خدا کی ضرورت یہی تھی تو اسے عورت تخلیق کرنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی؟ بائبل میں ہم دیکھتے ہیں کہ خدا بار ہا اپنے فیصلوں پر پچھتاتا ہوا نظر آتا ہے۔ شاید عورت کی تخلیق کے بعد بھی یہی صورت حال پیدا ہوگئی، لہٰذا خدا نے اپنی غلطی کا کفارہ پال کی معرفت یہ حکم دے کر کیا کہ مَرد عورتوں کو فراموش کر دیں اور اگر وہ اپنی ہوس پر قابو نہ پا سکیں اور جنسی بخار میں جلنے لگیں تو عورت کو اس طرح استعمال کیا جائے جیسے تپتے ہوئے بخار میں کونین جیسی کڑوی دوا کو بحالتِ مجبوری استعمال کیا جاتا ہے۔

شاید آپ حیران ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ عیسائی اخلاقیات میں کونین اور عورت ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔ کونین جیسی کڑوی دوا کا استعمال اس وقت تک نہیں کیا جاتا جب تک کہ مریض انتہائی شدت کے بخار سے تپ نہ رہا ہو اور موت واقع ہونے کا اندیشہ ہو۔ عیسائیت میں عورت کا استعمال بطور بیوی ہی نہیں بلکہ داشتہ کے طور پر بھی (اس کا تفصیلی ذکر آگے درج ہے) صرف اس صورت میں کیا جاتا ہے جب ''خدا کے فرزند'' جنسی بخار کی حدت سے جل جانے کے قریب ہوں۔ چنانچہ پال فرماتے ہیں:

> ''پس میں بے بیاہوں اور بیواؤں سے یہ کہتا ہوں کہ ان کے لئے اچھا ہے کہ جیسا میں ہوں وہ ویسے ہی رہیں، لیکن اگر خود ضبطی ان سے نہ ہو سکے تو بیاہ کریں کیونکہ بیاہ کرنا جل جانے سے بہتر ہے۔'' (۱۔قرنتیون: باب ۷: ۷ تا ۹)

عہد نامہ جدید کا مندرجہ بالا حوالہ اس امر کی دلیل ہے کہ عیسائی مذہب شادی کی اجازت صرف اس صورت میں دیتا ہے جب کوئی اور تدبیر کارگر نہ رہے۔ یہاں اس مقدس بندھن کو ایسی برائی سے تشبیہہ دی گئی ہے جو صرف ناگزیر حالت میں جائز قرار پاتا ہے وگرنہ نہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ عیسائی عقائد کے مطابق خدا کے فرزندوں کی راہ میں حائل سب سے قابل نفرین شے عورت ہے اور یہی وہ مخلوق ہے جس نے آدم علیہ السلام کو جنت میں اپنی نسوانیت کے باعث بے حرمت کیا اور اسے خدا سے دور کر دیا۔ اس مذہب میں

کامل مَردوں کی خصوصیت بھی یہی بیان کی گئی ہے کہ وہ عورتوں کے ساتھ آلودہ نہیں ہوتے۔

''یہ وہ ہیں جو عورتوں کے ساتھ آلودہ نہ ہوئے کیونکہ وہ کنوارے ہیں۔'' (مکاشفہ ۱۴/۴)

سینٹ جیروم کے اس فتوے کا حوالہ دیتے ہوئے جس میں کہا گیا ہے کہ ''قابل ملامت ہے وہ دوشیزہ جو برہنہ ہو کر غسل کرتی ہے'' لیکی کہتا ہے کہ فطری جذبات کی ظالمانہ بندش کا نفسیاتی اجر مغربی اقوام کو یہ ملا کہ انہیں نہ صرف کلیسا کے ہاتھوں ظلم و بربریت کا سامنا کرنا پڑا اور محکمہ احتساب کے ہاتھوں ناقابل بیان تشدد برداشت کرنا پڑا' بلکہ ان کے معاشرے میں خواتین کی بے حرمتی' ہم جنسیت اور محرمات کے ساتھ مباشرت جیسے گھناؤنے اور کج روانہ اطوار بھی نہایت مضبوطی سے جڑیں پکڑ گئے۔ اور تو اور' خود پادریوں اور ننوں کی کج روی کی اُنیس صدیوں پر محیط داستانیں مذہب سے بغاوت کا اہم سبب بن گئیں۔

خواتین سے متعلق بغض و عناد' کینہ اور تعصب اہل کلیسا ہی میں نہیں بلکہ خود جناب یسوعؑ سے منسوب کردہ ان جملوں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے جہاں اس سوال کے جواب میں کہ آدمی کب تک مرتے رہیں گے' کہا جاتا ہے کہ اُس وقت تک جب تک عورتیں بچے جنتی رہیں گی۔ گویا بچے پیدا کرنے کی ذمہ داری بھی صرف عورت ہی پر ڈال دی گئی ہے مَرد پیدائش کے اس سارے عمل سے مستثنیٰ ہیں۔ نیز اہل کلیسا مذکورہ بالا موت سے مراد خواہ طبعی موت لیں یا روحانی' ذمہ دار بہرحال عورت ہی ہے۔ ایک اور مقام پر جناب یسوعؑ سے یہ الفاظ منسوب کئے گئے ہیں:

> ''اگر کوئی آدمی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور بچوں اور بھائیوں اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی کینہ نہ رکھے تو وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔'' (لوقا ۱۴/۲۶)

قطع نظر اس کے کہ یہ ارشاد گھریلو زندگی کا امن کس قدر تباہ و برباد کر سکتا ہے (اور یورپ میں ہوا بھی یہی ہے)' قابل غور بات یہ ہے کہ اناجیل اربعہ میں جناب یسوعؑ آپ کو ''اگر کوئی آدمی' اگر کوئی آدمی'' ہی کہتے ہوئے ملیں گے' آپؑ کے وعظ و نصیحت میں ایسے جملے نہایت نایاب ہیں جن میں خواتین کو براہِ راست مخاطب کیا گیا ہو۔ اناجیل ہی کے مطالعہ سے یہ بات بھی آشکار ہوتی ہے کہ جناب یسوعؑ کا دیگر خواتین ہی نہیں بلکہ خود اپنی والدہ سے' جن کی کوکھ سے وہ پیدا ہوئے اور جن کی گود میں انہوں نے پرورش پائی' رویہ نہایت نامناسب تھا۔ قانائے جلیل میں منعقدہ ایک عروسی تقریب میں جب جناب یسوعؑ کی والدہ اپنے فرزند

سے کہتی ہیں کہ ضیافت میں بلائے گئے مہمانوں کے لئے مئے گھٹ گئی ہے تو جناب یسوعؑ اپنی والدہ کو نہایت درشت لہجے میں جواب دیتے ہیں : ''اے خاتون! مجھے اور تجھے کیا؟'' (یوحنا۲/۴) اسی طرح ایک اور مقام پر جب جناب یسوعؑ کو کہا جاتا ہے کہ آپ کی والدہ اور آپ کے بھائی باہر کھڑے ہیں اور آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں تو وہ اس طرح مخاطب ہوتے ہیں:

''کون ہے میری ماں اور کون ہیں میرے بھائی؟'' (متی ۱۲/۴۸)

عیسائیت میں مخنث بننے کی ترغیب

حد یہ ہے کہ سماوی بادشاہت کے بارے میں بھی جناب یسوعؑ کا نظریہ یہ تھا کہ وہ عورت کے بغیر ہوگی' بلکہ آپ اگر تلخی الفاظ گوارا فرمائیں تو یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ جناب یسوع کے نزدیک تو مَرد بھی سماوی بادشاہت میں داخلے کے اہل نہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مَرد اور عورت دونوں سماوی بادشاہت کے قابل نہیں تو پھر کون سی مخلوق اس حق کی اہل ہے؟ اسے آپ جناب یسوع سے منسوب ان الفاظ سے خود جان لیجئے!

> ''شاگردوں نے اس سے کہا کہ اگر مَرد کا بیوی کے ساتھ ایسا ہی حال ہے تو بیاہ کرنا ہی اچھا نہیں۔ اس نے ان سے کہا' یہ بات سب کی سمجھ میں نہیں آتی مگر ان کی جن کو دیا گیا ہے۔ بعض تو خوجے ہیں جو ماں کے بطن ہی سے ایسے پیدا ہوتے ہیں اور بعض خوجے ہیں جنہیں آدمیوں نے خوجہ بنایا اور بعض خوجے ہیں جنہوں نے آسمان کی بادشاہی کے لئے اپنے آپ کو خوجہ بنایا۔ جو سمجھ سکے وہ سمجھ لے۔'' (متی ۱۲-۱۹/۱۰)

جناب یسوع سے منسوب اس نصیحت کو مقدم رکھتے ہوئے Origen (۱۸۵ء تا ۲۵۴ء) نے' جو کہ تیسری صدی کے نہایت اہم کلیسائی مصنفوں میں شمار کئے جاتے ہیں' سماوی بادشاہت میں داخلے کو حتمی اور قطعی بنانے کے لئے اپنے آپ کو مخنث بنا لیا تھا۔ جناب یسوع کی اس نصیحت کے جس قدر تباہ کن اثرات مرتب ہو سکتے ہیں ان کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اہل کلیسا اب یہ کہتے ہیں کہ Origen نے جناب یسوع کی اس نصیحت کا غلط مفہوم لیا۔ دراصل کلیسا کا یہ رویہ دوغلے پن کی معراج کی ایک مثال ہے۔ کلیسا پہلے ہر بری شے کی پوری شدت کے ساتھ تبلیغ کرتا ہے اور اسے عقائد کا حصہ بنا لیتا ہے۔ جب یہ عقائد مروج ہو جاتے ہیں اور ان کے بد اثرات معاشرے پر ظاہر ہونا شروع ہوتے ہیں' جس کے ردِعمل کے طور پر کلیسائی عقائد پر سخت تنقید ہوتی ہے تو نتیجتاً کلیسا اپنے عقائد کو خیر باد کہہ کر یہ کہنا شروع کر دیتا ہے کہ

جناب یسوع کا یہ مطلب نہ تھا جو اب تک سمجھا جاتا رہا ہے۔ کلیسا جناب یسوع کی اس نصیحت کو خواہ کسی طرح جھٹلانے کی کوشش کرے' ساوی بادشاہت میں داخلے کے لئے خوجہ ہونے سے مراد یہی کچھ تھا جو جناب یسوع کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ چنانچہ آریگن اور اس کے شاگردوں' ویلی رئس (Valerius)' اولپیا کے میتھوڈس' میکٹس اور فلوسوفس وغیرہ نے جناب یسوع کی اس تعلیم پر عمل کرتے ہوئے اپنے آپ کو خوجہ بنالیا۔ مغربی تاریخ کے مطالعے سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عیسائیوں میں باقاعدہ ایک فرقہ ایسا موجود رہا ہے جو ساوی بادشاہت میں داخلے کے لئے مخنث ہونا اوّلین اور لازمی شرط گردانتا تھا' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تصلیب کے بعد پوری ایک صدی تک عیسائی مبلغ مخنث ہونے کی باقاعدہ ترغیب دیا کرتے تھے۔ عیسائیت کے اس طرزِ عمل کے بارے میں Ludovici تحریر کرتا ہے:

''یہ کہا جاتا ہے کہ اپنے آپ کو خوجہ بنانے کے بعد Origen کو اپنے فعل پر سخت پشیمانی ہوئی' لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب یہ معاملہ اس کے بشپ دیمی تراس تک پہنچا تو اس نے آریگن کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے یہ نصیحت کی کہ وہ آئندہ بھی یسوع کی دیگر تعلیمات پر اسی جوش و جذبے کے ساتھ عمل کرنے کی کوشش کرے''۔ (Ludovici:Man p.290)

آریگن کا مکتبہ فکر تیسری صدی کے آخر تک اس طرزِ عمل کی کھلم کھلا تبلیغ کرتا رہا۔ یہ وہ دور تھا جب عیسائی اخلاقیات کی عمارت کی بنیادیں قائم ہو رہی تھیں۔ چنانچہ عیسائی اخلاقیات کی عمارت جنسی نفس کشی اور مجردانہ زندگی پر استوار کی گئی' ازدواجی زندگی ایک تہمت قرار پائی اور کنوارپنے کو انسانی اخلاقیات کی معراج سمجھا جانے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ انیس صدیوں میں مغرب خانقاہی نظام کا نہایت مضبوط گڑھ بنا رہا ہے۔ یہاں خانقاہوں کا ایک وسیع سلسلہ تھا جہاں ''خدا کے فرزند'' مجردانہ زندگی گزارتے گزارتے موت کے گڑھے میں جا اترتے۔ آج بھی پورے کلیسائی نظام کی بنیاد مجردانہ عقائد پر ہی استوار ہے۔ معروف مغربی فلسفی اور دانشور لیکی' جس کی پرورش کلیسا کے اسی گھٹن زدہ ماحول میں ہوئی تھی' تحریر کرتا ہے:

''انسانی اخلاقیات کی تاریخ میں اس قدر تاریک اور اذیت دہ وقت کبھی نہیں آیا جب مغرب میں رہبانیت نے ایک وبائی مرض کی صورت اختیار کر لی۔ تب وحشت سے معمور تنگدل و تنگ نظر خبطی اور کمزور قوت ارادی کے حامل انسان نما وحشیوں نے جانوروں سے بھی پست سطح پر بے مقصد و لاحاصل زندگیاں گزارنا شروع کر دیں۔

سب سے بڑھ کر ظلم یہ ہوا کہ خود ایذائی کے عمل کے باعث ان کے ذہن ناکارہ ہو گئے اور انہوں نے مہیب اقسام کے توہمات گھڑنے شروع کر دیئے۔ بعد ازاں توہم پرست معاشرے نے ان بدحواس' غلیظ اور غیر مہذب مکروہ لوگوں کو' جو ہذیانی کیفیات کا شکار تھے' پیروی کے قابل معیاری انسان کا نمونہ جان کر قبول کر لیا۔''

(History of European Morals, vol.II. pp.105-107)

آج کلیسائی ماہرین عیسائیات (Christianologist) بطور حجت یہ کہتے ہیں کہ آریگن نے جناب یسوع کی نصیحت کے باطنی مفہوم کو سمجھنے میں غلطی کی اور خود کو خوجہ بنا لیا' لیکن جیسا کہ اس سے قبل بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ ایک ایسی منافقت ہے جس کا اظہار کرتے ہوئے اہل کلیسا کی پیشانی پر کبھی ندامت کی دو بوندیں بھی نہیں آئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بائبل کے عہد نامہ قدیم و جدید اور پوری عیسائی تاریخ کا طرز فکر ہی مجردانہ کیفیات کا حامل ہے۔ عیسائیت میں جسمانی و روحانی پاکیزگی کا حصول' ازدواجی تعلقات سے پرہیز پر مشروط ہے۔ کلیسائی عقائد کے مطابق کوئی بھی انسان' خواہ وہ کتنا ہی پرہیزگار' نیک' خوش اخلاق اور جذبہ ترحم سے مالا مال ہو اُس وقت تک روحانی پاکیزگی حاصل نہیں کر سکتا جب تک وہ خود کو عورت جیسی نجس شے سے آلودہ کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ اسی سوچ کے زیر اثر مغرب کے مذہبی و غیر مذہبی ادب میں عورت کو ایک قابل نفرین شے کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ جوزف میک کے بے اس طرزِ فکر کے بارے میں تحریر کرتا ہے کہ:

''اٹھارہویں صدی سے قبل تک یورپ کے بڑے بڑے مشاہرین' ادیب اور نظم نگار خواتین کے لئے پاجی' کند ذہن اور فاتر العقل جیسی اصطلاحات آزادانہ طور پر استعمال کرتے رہے۔''

(Joseph McCabe:Women and Political Evolution)

جہاں تک بچوں کا تعلق ہے' کلیسا نے بچوں سے یسوع کی محبت کو اس قدر وسیع پیمانے پر مشہور کیا ہے کہ بسا اوقات محسوس ہوتا ہے جیسے اس خوبصورت جذبے پر صرف عیسائیت ہی کی اجارہ داری ہے۔

''اور وہ چھوٹے بچوں کو بھی اس کے پاس لانے لگے تا کہ ان کو چھوئے۔ شاگردوں نے دیکھ کر ان کو جھڑکا مگر یسوع نے انہیں پاس بلا کر کہا کہ بچوں کو میرے پاس آنے دو اور انہیں منع نہ کرو کیونکہ خدا کی بادشاہی ایسوں کی ہے۔'' (لوقا ۱۸: ۱۵۔۱۶)

یہ ہے وہ حوالہ جو یسوع کی بچوں سے محبت کے لئے بار بار دیا جاتا ہے۔ یقیناً جناب یسوع کو بچوں سے محبت ہوگی اور ہر انسان بچوں سے پیار کرتا ہے' لیکن اگر آپ اس حوالے کو غور سے پڑھیں تو اس بات کا مطلب یہ ہے کہ جناب یسوع بچوں سے الفت کا اظہار اس لئے نہیں کر رہے ہیں کہ وہ بچے ہیں' بلکہ وہ شاگردوں کو بتانا چاہ رہے ہیں کہ سماوی بادشاہت میں صرف وہ لوگ داخل ہوسکیں گے جو بچوں کی طرح معصوم ہوں گے' کیونکہ عیسائی عقائد کے مطابق سماوی بادشاہت میں بچوں کا داخلہ ذرا مشکل ہی ہے۔ ملاحظہ ہو:

''جو بچے بپتسمہ لینے سے قبل فوت ہو گئے' وہ کبھی خداوند کی بادشاہت نہیں دیکھ سکیں گے۔'' (Aquinas:The Summa Theologica Q.75 p.714. V)

اور خود عہد نامہ جدید کے مطابق وہ مَرد جو عورت سے آلودہ ہونے سے بچ رہے یا پھر جن کی بیویاں ہیں لیکن وہ ایسے رہ رہے ہوں جیسے ان کی بیویاں ہیں ہی نہیں' وہ جناب یسوع کی سماوی بادشاہت کو رونق افروز کرنے کے لئے بچے کہاں سے لائیں گے؟ اسی طرح وہ خواتین جن کے بچے ہوں جناب یسوع کی پیشین گوئی کے مطابق رنج و مصیبت میں مبتلا ہوں گی' جبکہ ایسی خواتین جو بانجھ ہوں گی اور وہ رحم جو بار ور نہ ہوئے اور وہ چھاتیاں جنہوں نے دودھ نہ پلایا مبارک باد کی مستحق ہوں گی (لوقا ۲۳:۲۸۔۲۹)۔ تو ایک اچھی عیسائی خاتون جناب یسوع کی اس نصیحت کو مدنظر رکھتے ہوئے بچہ پیدا کرنے کے فطری وظیفہ کی ادائیگی کے لئے کس طرح راضی ہو سکے گی؟ راضی ہونے کا سوال بھی تب پیدا ہوتا ہے جب ازدواجی تعلق کا کوئی سبب پیدا ہو' لیکن جناب یسوع سماوی بادشاہت میں داخلے کے لئے ''خوجہ'' ہونا لازمی گردانتے ہیں۔

ازدواجی تعلق: سماوی بادشاہت میں داخلے کی رکاوٹ

حقیقت تو یہ ہے کہ عملی طور پر عیسائیت نے کبھی بھی عورت کے مکمل وجود کو قبول نہیں کیا اور اس سے تعلق کو سماوی بادشاہت میں داخلے کی واحد رکاوٹ قرار دے کر ایسے معاشرے کا تصور پیش کیا جو صرف خوجے اور باکر مَردوں پر مشتمل ہو۔ خواتین کی عدم برداشت' ان کی مادرانہ شفقت کی بیخ کنی اور فطری جذبات پر کڑی اور غیر ضروری پابندیاں' یہ سارے عوامل مل کر خواتین کے وجود کے طبعی اور روحانی دونوں حصوں کی مکمل نفی کر دیتے ہیں۔ جناب یسوع ایک ایسی خاتون کو جو شاید بے قصور ہو اور اسے اس کی مرضی کے خلاف طلاق دے دی گئی ہو' جس نظر سے دیکھتے ہیں وہ عیسائی خاتون کے لئے ایک لمحہ فکریہ بھی بن سکتا ہے:

''پر میں تم سے کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی بیوی کو حرام کاری کے سوا کسی اور وجہ سے چھوڑ دے اور دوسری سے بیاہ کرے' زنا کرتا ہے اور جو کوئی اس چھوڑی ہوئی کو بیاہے' زنا کرتا ہے۔'' (متی ۹:۱۹)

اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ عیسائی عقائد کے مطابق ایسا معاشرہ جس میں ایسے مَرد موجود ہوں جن کی بیویاں ہوں لیکن وہ ایسے رہ رہے ہوں جیسے ان کی بیویاں ہیں ہی نہیں (۱۔قرنتیون ۲۹:۷)' وہاں حرام کاری نہ ہوگی تو اور کیا ہوگا؟ بہرحال اہل مغرب ''خدا کے اکلوتے فرزند'' کے فرمودہ کی جس طرح بھی وضاحت کریں اور حسبِ معمول خلق خدا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی سعی کریں' ہمیں اس فرمان سے ایک بے خانماں و بے یارومددگار عورت کی سماج میں حیثیت کے بارے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔ ایک ایسی غریب خاتون کو جسے شاید بلاقصور طلاق دے دی گئی ہو اور وہ پاکباز ہو' جناب یسوعؑ سے منسوب الفاظ میں نہ صرف ایک زنائی عورت کی حیثیت دی گئی ہے' بلکہ اس کی باقی ماندہ زندگی کو جہنم بنانے میں بھی کوئی کسر باقی نہیں رہنے دی گئی۔ جس معاشرے میں خواتین کو اس حد تک مجبور و بے کس بنا دیا جائے کہ وہ معاشی تحفظ کے لئے شادی بھی نہ کر سکیں تو لامحالہ اس معاشرے میں زنا کاری کے جراثیم پرورش پانے لگیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ برٹنڈ رسل نے عیسائیت کے اس طرزِ فکر پر سخت تنقید کی ہے۔ یہ کہنے کے بعد کہ چرچ نے نہ صرف غلامی کے خاتمے کی شدید مخالفت کی بلکہ ہر ایسی تحریک کی بھی مخالفت کی جس سے انسانیت کو فروغ حاصل ہوتا ہے' رسل تحریر کرتا ہے:

''عیسائی مذہب کی بدترین خصوصیت اس کا جنس کے بارے میں رویہ ہے۔ ہمیں یہ باور کرایا جاتا ہے کہ کلیسا نے خواتین کے مقام کو بلند کیا ہے حالانکہ یہ تاریخ انسانی کی مکروہ ترین دروغ گوئی ہے۔''

(B.Russal : Why I am not a Christian?)

عیسائی عقائد کے مطابق مغرب نے خواتین کو تمام برائیوں کی جڑ قرار دے کر پہلے ذلت و پستی کے سمندر میں دھکیلا' پھر احساسِ ندامت کو کم کرنے کے لئے ننوں کا ادارہ قائم کیا' لیکن اس ادارے میں بھی شمولیت کے لئے غیر ازدواجی زندگی لازمی شرط قرار دے دی گئی۔ بلاشبہ ننوں کی صورت میں عیسائی خواتین کو مغربی معاشرے میں تھوڑی سی عزت حاصل ہوئی لیکن اس معمولی عزت کے حصول کی خاطر انہیں بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ انہیں یہ مختصر سا مقام اپنی نسوانیت کی قیمت ادا کر کے حاصل ہوا اور بجا طور پر زندگی کی ان لطافتوں کی

قیمت پر حاصل ہوا جو خالق کائنات نے انہیں عورت کی شکل میں تخلیق کر کے عطا فرمائی تھیں۔

سنتِ نبویؐ کا روشن مینار

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد مبارک کہ: ((اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ)) ''نکاح میری سنت ہے'' اور یہ کہ ((فَمَنْ رَّغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ)) ''جو میری سنت سے روگردانی کرتا ہے وہ مجھ میں سے نہیں ہے'' ظلمت میں روشنی کی جگمگاتی کرن کی حیثیت رکھتا ہے۔ غیر ازدواجی زندگی کی ترغیب اور اس پر لگائی گئی پابندیاں اور قدغنیں لازمی طور پر انسان کو گناہ آلود کر دیتی ہیں۔ نکاح کی زندگی ہی انسانی پاکیزگی کی ضامن ہے اور پاکیزہ جنسی تعلق ہی معاشرے میں زنا کاری کا مدلل سدباب ہے۔ اس سے معاشرہ اخلاقی افراتفری، بگاڑ اور ٹوٹ پھوٹ سے مکمل طور پر محفوظ رہتا ہے۔ عصر حاضر میں تہذیبِ فرنگ کی اخلاقی زبوں حالی اور پستی ہمارے اس استدلال کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔ اسلامی فلسفہ حیات کی یہی وہ مضبوط فصیل ہے جس پر اب اہل مغرب نقب لگانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

حقوقِ نسواں کی دُہائی ـــــ اصل حقیقت!

آج ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائی مغرب خواتین کے حقوق کا علمبردار بن کر اٹھ کھڑا ہوا ہے اور ساری دنیا کی مت اس قدر ماری گئی ہے کہ وہ مغرب کی نسوانی تحریک کی نہ صرف مدح سرائی کر رہی ہے بلکہ اسے فیشن کی طرح تیزی سے اپناتی بھی جا رہی ہے۔ خواتین کے حقوق کے معاملے پر مغرب کی ہاہا کار کی اصل حقیقت سے دنیا کو آگاہ کیا جائے تو بڑی ہی مضحکہ خیز صورت حال سامنے آتی ہے۔ مثلاً کلیسا نے ایک ایسے شخص کو (جون xxiii) پاپائیت کے عہدے پر مسلسل پانچ برس قبول کئے رکھا جسے گبن تاریخ انسانی کا سب سے بدکار، بدچلن اور شہوت پرست انسان قرار دیتا ہے۔ یہ شخص بحری قزاقی، قتل، جبری عصمتیں لوٹنے، ہم جنسیت اور محرمات سے مباشرت جیسے سنگین جرائم میں ملوث تھا، لیکن اسے کلیسائی بزرگوں نے محض اس لئے پاپائیت کے رتبہ پر فائز کئے رکھا کہ وہ اپنی دہشت اور ظلم کو کام میں لا کر نفاقِ عظیم (Great Schism) کا خاتمہ کر سکے۔ اسی کلیسا نے، جس نے پاپائیت کے لئے ایک بدکار وزنا کار شخص کو قبول کر لیا تھا، ہمیشہ سے کسی بھی خاتون کو پاپائیت کے عہدے پر فائز کرنے کی شدید مخالفت کی ہے جو جون ۲۳ کے برعکس خواہ نیکوکار و باکردار ہی کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ پوری عیسائیت میں، ماسوائے ایک خاتون کے، کسی بھی ایسی خاتون کا ذکر مفقود ہے جس

نے کلیسا میں اہم مقام حاصل کیا ہو۔ اتفاق سے اس واحد خاتون کا نام بھی جون ہی ہے' اسے ۱۱۰۰ء میں پوپ کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ یہ خاتون مَرد کا روپ دھار کر پوپ بنی رہی' لیکن جب اہل کلیسا پر یہ راز منکشف ہوا کہ جون مرد نہیں عورت ہے تو اسے اگلے روز مُردہ حالت میں پایا گیا۔ گو کہ آکسفورڈ ڈکشنری آف دی کرسچین چرچ کے مؤلفین اس واقعہ کو ایک من گھڑت کہانی قرار دیتے ہیں لیکن وہ تاریخی حقائق کو مؤثر دلائل سے جھٹلانے میں ناکام رہے ہیں۔ کلیسا اور پاپائیت کی زیادتیاں اور بدعنوانیاں اس قدر ہیں کہ لاکھ پردے ڈالنے اور دروغ بافی کے باوجود عیسائیت کی خاتون دشمنی کسی طور پر پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

۱۸۲۷ء تک کلیسا نے ۱۲ پنس یا اس سے زائد کی رقم کی چوری کی سزا ''موت'' مقرر کر رکھی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اہل مغرب کے لئے تعلیم شجر ممنوعہ تھی اور کلیسا سے وابستہ افراد کے علاوہ چند گنے چنے لوگ ہی پڑھ لکھ سکتے تھے۔ چنانچہ نہایت ہوشیاری کے ساتھ یہ قانون بنایا گیا کہ اگر چوری کا مجرم زبور کی ۵۱ ویں لائن پڑھ کر سنا دے تو اس کی جان بخشی ہو سکتی تھی۔ اس طرح اہل کلیسا نے اپنی کھال محفوظ رکھنے کا بندوبست کر لیا۔ لیکن اصل بات بتانے کی یہ ہے کہ قانون کی یہ رعایت خواتین کے لئے ہرگز نہ تھی۔ یعنی اگر کوئی خاتون زبور کی ۵۱ ویں لائن پڑھ کر سنا بھی دیتی تب بھی اسے موت کے بے رحم ہاتھوں کے سپرد کر دیا جاتا (Criminal Law by Cross & Jones p.30)' بلکہ قانون تو اس قدر ترقی یافتہ تھا کہ کتوں کو بھی پھانسی کی سزا دی جاتی تھی۔ لہٰذا اگر یوں کہا جائے کہ مغرب میں عورت اور کتے کو برابر کے معیار پر پرکھا جاتا رہا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اگرچہ یہ ایک سخت جملہ ہے' مگر حقیقت یہی ہے کہ یورپ میں خواتین کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جاتا ہے جو کتوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ آج بھی یورپی خواتین کے پالتو جانوروں میں سب سے ہر دل عزیز جانور کتا ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عصر حاضر ہی نہیں بلکہ پوری عیسائی تاریخ میں عورت اور کتا آپ کو ہم قدم چلتے ہوئے نظر آئیں گے۔

مغربی عورت —— مظلومیت کا نشانِ عبرت

رابرٹ بریفالٹ نے اپنی کتاب The Making of Humanity میں خواتین کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ ہمارے مذہب (عیسائیت) میں خاتون کے لئے اگر کوئی مقام ہے تو وہ اسے تب حاصل ہوگا جب وہ اگلے جہان میں پہنچ چکی ہوگی۔ اپنے اس قول کی دلیل دیتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ جب Alaric روم کو لوٹ رہا تھا' مکانات نذرِ آتش کئے جا

رہے تھے اور وحشی فوجی خواتین کی عصمتیں پامال کر رہے تھے تب سینٹ آگسٹائن اس فکر میں غلطاں تھا کہ وہ کنواری لڑکیاں جن کی عصمتیں لوٹی جا رہی ہیں' کیا اس قابل ہوں گی کہ اگلی دنیا میں ان کے سر پر دوشیزگی کا تاج سجایا جا سکے گا! یہ وہی دوشیزگی ہے جس کی حفاظت پر جیروم نے اتنا زور دیا تھا کہ غسل سے بھی منع کر دیا تھا اور مَردوں کو تاکید کی تھی کہ وہ سماوی بادشاہت میں داخلے کا پاسپورٹ حاصل کرنے کے لئے خود کو خوجہ بنالیں اور عورت سے آلودہ نہ ہوں۔ یہی وہ تعلیم تھی جس کی عیسائیت صدیوں سے تبلیغ کرتی رہی۔ بجائے اس کے کہ جنسی رویوں کو پاکیزہ اور مطہر عمل کے ذریعے انسانی زندگی میں داخلے کی اجازت دی جاتی' عیسائیت نے ان پر کڑی بندش لگا دی۔ اس گھٹن کا نتیجہ یہ نکلا کہ اولاً کلیسا سے وابستہ افراد اور ثانیاً پورا مغربی معاشرہ ایک ایسے جنسی مرض (Sadism) میں مبتلا ہو گیا جس میں مریض حسب خواہش آسودگی حاصل کرنے کے لئے ایذا رسانی پر اتر آتا ہے اور اس عمل میں اسے لذت محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ کلیسا نے نہ صرف اپنے مخالفین کو ایذا دینے کے لئے وحشت انگیز سزائیں ایجاد کیں بلکہ یہ مذہبی اجارہ دار اپنے آپ کو بھی اذیتوں میں مبتلا کر کے سکون محسوس کرنے لگے۔

اس تمام عرصے میں خواتین خصوصی طور پر کلیسائی اذیت گاہوں کی خوراک بنتی رہیں۔ چونکہ عائلی زندگی کو خدا کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا گیا تھا اور مَرد کی عورت سے آلودگی آسمانی بادشاہت میں داخلے کے لئے شجر ممنوعہ تھی لہٰذا ناآسودہ جنسی جذبات کے مارے ہوئے مغربی معاشرے نے ردعمل کے طور پر جنسی تعلقات میں ایسی مادر پدر آزادی کا علَم بغاوت بلند کیا کہ وہ معاشرہ جہاں کنوارپن ہی سب سے بڑی نیکی اور اخلاقیات کی معراج اعلیٰ سمجھا جاتا تھا' آج اسی مغرب میں عفت و عصمت کا کھویا جانا ہی سب سے ارفع نیکی قرار پا گیا ہے۔

عصر حاضر میں عیسائی مغرب کی نسوانی تحریک ذہنی پراگندگی کا شکار اُن خواتین کی تحریک ہے جو اپنے مذہبی پیشواؤں بلکہ خود ''خدا'' کی جانب سے ردّ کئے جانے اور گناہوں کی جڑ قرار دیئے جانے' نیز تحقیر و ذلت اور صدیوں پر پھیلے ہوئے کلیسائی نظام سے تنگ آ چکی ہیں۔ ان کے ساتھ ظلم یہ ہوا ہے کہ یہ نادان خواتین اپنے سے برتے گئے مظالم اور مذہبی تحقیر کی زنجیر سے آزاد ہوتے ہوئے معاشی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دی گئی ہیں۔ فکری و معاشی آزادی کے حصول کے لئے اب مغرب کی عورت اپنے آپ کو سنوار کر رکھتی ہے اور جاذبِ نظر آنے کی کوشش میں مصروف دکھائی دیتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جمالیاتی ذوق کا اظہار

کرتی ہے۔ اب وہ اپنے حسن کا اظہار اپنے شوہر کے لئے نہیں بلکہ اُن مَردوں کے لئے کرتی ہے جنہوں نے چند کرنسی نوٹوں کے عوض انہیں معاوضے پر ملازم رکھا ہوتا ہے۔ یہ عورت معاشی آزادی کے لئے اپنی رضا، رغبت اور منشا سے اپنی عفت گنوا کر اس پر فخر کرنا بھی سیکھ چکی ہے۔ مغربی معاشرے میں مادر پدر جنسی آزادی تو عصر حاضر کی پیداوار ہے لیکن خود کلیسائی حلقوں میں، جہاں عفت و عصمت کا برقرار رکھنا جزوِ لازم تھا، یہ عمل کافی عرصہ قبل شروع ہو چکا تھا۔ تاریخ اخلاقیاتِ یورپ کا مصنف لیکی تحریر کرتا ہے کہ:

''پاپائیت اور اس کے بعد کے زمانے کے جن قلمکاروں کی تحریریں ہم تک پہنچ سکی ہیں وہ اس امر کی شاہد ہیں کہ ننوں کی رہائش گاہوں میں ناجائز بچوں کی طفل کشی بڑے پیمانے پر کی جاتی تھی اور چرچ سے وابستہ افراد میں محرمات سے مباشرت اس قدر زور پکڑ گئی تھی کہ کلیسا نے پادریوں کو ان حرکاتِ خبیثہ سے روکنے کے لئے بارہا سخت قوانین بھی وضع کئے، حتیٰ کہ انہیں اپنی ماؤں اور بہنوں کے ساتھ رہائش اختیار کرنے سے بھی کلی طور پر منع کر دیا گیا۔''

وہ بدبخت جنہوں نے خود ساختہ بدعات و تعلیمات کو جناب یسوع علیہ السلام کے نام نامی سے منسوب کیا، یقیناً اس حقیقت سے نابلد تھے کہ جسمانی لطائف سے تیاگ اور خانقاہی زندگی انسانوں کو اس شرمناک راستے کے علاوہ کسی اور پاکیزہ راہ کی جانب گامزن کر ہی نہیں سکتی۔ جوزف میک کے بے تحریر کرتا ہے کہ ایک وقت وہ بھی آیا جب صورت حال اتنی سنگین ہو چکی تھی کہ کلیسائی حلقوں نے اپنے خاندان سے وابستہ خواتین کی عفت کی حفاظت کے لئے پادریوں کو اس امر کی اجازت دے دی کہ وہ اپنے شیطانی نفس کی تسکین کے لئے داشتائیں رکھ لیں۔

(The Social Record of Christianity, by Joseph McCabe)

اہل کلیسا کی اخلاقی گراوٹ کی انتہا

لیکی اور میک کے بے نے زمانہ پاپائیت کی بدعنوانیوں اور شہوت پرستیوں کا ذکر کیا تو ہے لیکن ایک اور اہم حقیقت کی جانب شاید وہ جان بوجھ کر نہ آ سکے اور وہ یہ کہ پاپائیت کا زمانہ تو بہت دور کی بات ہے، اُس وقت بھی، جب کہ خود ساختہ رسول پولوس اپنی بدعات کو جناب یسوع کے نام سے فروغ دے رہا تھا، کلیسا ایسی برائی میں مبتلا تھا جس کی جانب آج اہل مغرب دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے کہ ان کا ماضی کس قدر شاندار رہا ہے۔ کلیسا کے نام ایک خط میں پولوس تحریر کرتا ہے:

''اکثروں سے سنتے ہیں کہ تمہارے درمیان حرام کاری ہوتی ہے اور ایسی حرام کاری جیسی غیر قوموں میں بھی نہیں ہوتی یعنی کہ ایک آدمی اپنے باپ کی بیوی کو رکھتا ہے اور تم پھولتے ہو۔'' (۱۔قرنتیون ۱:۵)

ماؤں سے مباشرت وحرام کاری کلیسائی حلقوں کے لئے ایک ایسا سیاہ داغ ہے جس کی سیاہی انیس صدیاں گزرنے کے بعد بھی کلیسا کی پیشانی پر دیکھی جاسکتی ہے۔کلیسا سے وابستہ افراد کی اخلاقی زبوں حالی کے قصے آئے روز ابلاغ عامہ کی زینت بنتے رہتے ہیں۔امریکی مبلغ جمی سواگرٹ کی شہوت پرستی کی داستانیں خود امریکی ذرائع ابلاغ نے تصویری شہادتوں کے ساتھ پیش کیں تو امریکی چرچ میں ایک بھونچال سا آ گیا تھا۔آئرلینڈ کے کیتھولک چرچ سے وابستہ ۶۷ سالہ پادری برنڈن اسمتھ (Brendan Smyth) کی شہوت پرستی کی خبریں ذرائع ابلاغ میں آئیں تو آئرلینڈ کے وزیراعظم Albert Reynolds کو استعفا دینا پڑا' کیونکہ موصوف خود بھی اس پادری کی پشت پناہی کرتے رہے تھے' حالانکہ البرٹ رینالڈ جان میجر اور آئرش ری پبلکن آرمی کے جیری آدم کے مابین مذاکرات کا آغاز کر کے عالمی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ برنڈن اسمتھ کے جرائم سے نہ صرف کیتھولک چرچ بلکہ البرٹ رینالڈ بھی خوب اچھی طرح واقف تھے لیکن چرچ کی بدنامی کے باعث اس پادری کو نظرانداز کیا جاتا رہا' حتیٰ کہ اُس نے ۸ تا ۱۴ ربرس کی عمر کے تین لڑکوں اور پانچ لڑکیوں کے ساتھ غیر اخلاقی افعال انجام دینے کا اقرار کرلیا۔اس پادری سے جب یہ پوچھا گیا کہ وہ کس طرح بچوں کو اپنے شیطانی نفس کی تسکین کے لئے راغب کرتا تھا تو اس نے کہا کہ وہ کینڈی' نقد رقم اور اکثر اوقات سنہری صلیبی زنجیریں اور دعائیہ کتابیں بچوں کو دے کر ان سے غیر اخلاقی افعال کیا کرتا تھا۔ (۱)

دراصل چرچ نے عورت کی اس قدر تحقیر کی ہے کہ مغربی عیسائی اب انسانی ازدواجی زندگی کے دائروں سے باہر نکل کر بچوں اور جانوروں سے اپنے ناآسودہ جذبات کو تسکین

---

(۱) عیسائی پادریوں کی اخلاقی کج روی سے متعلق مزید معلومات کے حصول کے لئے قارئین صدیقی ٹرسٹ' نسیم پلازہ' نشتر روڈ' نزد لسبیلہ چوک' کراچی ۵ سے شائع ہونے والے کتابچے ''عیسائی پادریوں کا اخلاقی پہلو'' کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔اس کتابچے میں مشہور عالم رسالوں نیوز ویک اور ٹائم کے خصوصی ایڈیشن اور رپورٹیں یکجا کردی گئی ہیں۔ان رپورٹوں سے علم ہوتا ہے کہ آج مغربی معاشرہ اگر ہم جنس پرستی اور جانوروں سے مباشرت جیسے مکروہ افعال میں گرفتار ہے تو اس کے فروغ میں چرچ کا کس قدر حصہ ہے۔

فراہم کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں' مغربی معاشرے میں کتے اور عورت کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے' اور یہ کسی طرح غلط نہیں۔ ٹائم کی ۳ جولائی ۱۹۹۵ء کی اشاعت کے مطابق عریاں رسالوں' فلموں اور کمپیوٹر پروگراموں کی مارکیٹ کا وسیع حصہ مغربی عیسائی خواتین کی کتوں کے ساتھ مباشرت پر مبنی تصاویر پر مشتمل ہے۔ آج مغربی ادب میں مادر پدر جنسی آزادی کے باعث Homosexualism' Gayism' Lesbianism Sadomasochism اور Urinateism کے بعد Hebephilianism جیسی اصطلاحیں داخل ہوگئی ہیں جنہوں نے انسانیت کا سر شرم سے جھکا دیا ہے۔

مندرجہ بالا نفسیاتی رویئے دراصل اہل مغرب کا مذہب کے خلاف (جس کا انہیں عیسائیت کی شکل میں سامنا کرنا پڑا) ایک کے بعد دوسرے ردعمل کا اظہار ہیں۔ آج اگر اہل مغرب کی نفسیات' ان کے نظریات اور اعمال بے اعتدالی کی انتہائی کیفیات سے دوچار ہیں تو اس کی واحد وجہ وہ بدعات و خرافات ہیں جنہیں جناب یسوع کے نام سے منسوب کر کے الہامی کتب میں شامل کر دیا گیا تھا۔

تحریک نسواں کا پس منظر

تحریک نسواں کا بھی کم و بیش یہی پس منظر ہے۔ عیسائیت نے چونکہ عورت کے خلاف اس قدر سخت رویہ اپنایا کہ اسے ہر بدی کی جڑ قرار دیا' ایسے ہی نظریات نے مغرب کی عورت کی روح کو جھلسا کر رکھ دیا' لہٰذا آخری علاج کے طور پر اس عیسائی عورت نے مذہب کے خلاف بغاوت کر دی۔ سینٹ جیروم نے تو غسل کرتی خاتون کو لعنتی قرار دیا تھا' لیکن عیسائی عورت نے جب مذہب کے خلاف بغاوت کی تو سر عام اپنے آپ کو بے لباس کر ڈالا۔ مغرب کی عیسائی عورت کی مذہب اور مَردوں کے خلاف بغاوت نے اب بغض و عناد کی ایسی فضا پیدا کر دی ہے کہ اس کا رہا سہا احترام بھی ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ آزادی کے نام پر اس عیسائی عورت نے اپنا استحصال اس قدر کرایا ہے کہ اس کی عریانیت ایک کامیاب تجارت بن چکی ہے۔ یہ عیسائی عورت اس قدر نادان ہے کہ اس نے نام نہاد آزادی کی خاطر صدوںی مَردوں (Sadist Men) کی تسکین کے لئے اپنا آپ پیش کر دیا ہے' لیکن اس زیاں کا اسے ذرا بھی افسوس نہیں' بلکہ وہ مزید آزادی کی خواہاں ہے۔ آج مغرب کی عورت نے ازدواجی زندگی کو خیر باد کہہ کر اپنے آپ کو تماشہ بنا لیا ہے' بے سہارا بنا لیا ہے اور وہ یہ سمجھتی ہے کہ اسے آزادی نصیب ہوگئی ہے۔ اس نام نہاد آزادی نے اسے عزت و وقار اور احترام کے

اُس درجے سے بھی کہیں کمتر درجے پر پہنچا دیا ہے جو دنیا کے دیگر حصوں میں اس کی بہنوں کو حاصل ہے۔

مغرب کی عورت نے دراصل جس ناانصافی کے خلاف علَمِ بغاوت بلند کیا اس کا آغاز بقول Sir Henry Maine اُس وقت ہوا تھا جب رومن قانون کی جگہ پاپائیت نے اپنے قوانین متعارف کرائے' لیکن ہماری رائے کے مطابق اس ناانصافی کی ابتدا اس سے بھی بہت پہلے اُس وقت ہو چکی تھی جب درج ذیل کلمات کو جناب یسوعؑ سے منسوب کر کے اور الہام کا درجہ عطا کر کے کتب سماوی میں شامل کر دیا گیا تھا:

''اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور بچوں اور بھائیوں اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی کینہ نہ رکھے تو وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔'' (لوقا ۲۶:۱۴)

''جو شخص اپنی بیوی کو چھوڑ دے اور دوسری سے بیاہ کرے' وہ زنا کرتا ہے اور جو شوہر سے چھوڑی ہوئی کو بیاہے' وہ بھی زنا کرتا ہے۔'' (لوقا ۱۸:۱۶)

یہی نہیں بلکہ نام نہاد رسول پولوس نے' جس نے جناب یسوع کی ساری تعلیمات کو تبدیل کر کے رکھ دیا تھا' عائلی زندگی کے سکون کو یہ کہہ کر برباد کر دیا کہ اگر کنواری بیاہی جائے تو وہ گناہ نہیں کرتی مگر ایسے لوگ جسمانی تکلیف میں مبتلا ہوں گے اور مَرد عورت کے لئے نہیں بلکہ عورت مَرد کے لئے پیدا کی گئی ہے' لہٰذا چاہئے کہ عورت فرشتوں کے سبب سے اپنے سر پر محکوم ہونے کا نشان رکھے۔ (۱۔قرنتیون ۱۱:۷'۹ ۲۸)

بعد ازاں سینٹ ایمبروز' جیروم' آگسٹائن اور کلیسا کے دیگر بزرگان نے بھی عورت کے وجود کو نہایت ذلت کے ساتھ مسترد کرتے ہوئے اس بات سے اتفاق کیا کہ اس کی دلکشی فرزندانِ خدا کے لئے شیطان کا نعم البدل ہے' اس لئے تمام برائیوں کی جڑ بھی یہی ہے۔ انہوں نے عورت کے مقام کو اس قدر حقیر جانا کہ اسے بیوی ہی نہیں بلکہ ماں اور بہن کے روپ میں بھی قبول نہ کیا۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اسی کلیسا نے عورت کی بحیثیت ماں عزت نہ کی اور نہ ہی پاکیزہ عائلی زندگی کی حوصلہ افزائی کی لیکن اپنے پیروکاروں اور پادریوں کو یہ اجازت دے دی کہ وہ داشتائیں رکھ لیں اور جب وہ ماں بن جائیں تو انہیں دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے نکال باہر کریں۔

مغربی عورت کا معاشرے سے انتقام

آپ نے گزشتہ بحث سے یہ نتیجہ ضرور اخذ کیا ہو گا کہ کلیسا نے عورت کا کس قدر

استحصال کیا ہے۔ مغرب کی عیسائی عورت نے اپنی بے توقیری کا بدلہ یوں لیا ہے کہ آج پورا مغربی معاشرہ جنسی مریض بن چکا ہے اور پاکیزہ انسانی رشتے محض نام کو رہ گئے ہیں۔ عورت اور مَرد کے مابین عزت واحترام کے تمام رشتے اتنی بری طرح متاثر ہوئے ہیں کہ مغرب کی عیسائی عورت' شماریاتی تجزیوں کے مطابق سب سے زیادہ اپنے قریبی رشتہ داروں (باپ' دادا' نانا' چچا اور بھائیوں) کے ہاتھوں بے حرمت ہوتی ہے۔ اخلاقی گراوٹ' کج روی اور ناشائستہ وغیر مہذب طریقِ حیات مغرب کو غرقاب کرنے کے درپے ہے۔ آج ہم اقبال کی دُوررس نگاہوں کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے جنہوں نے مغرب کی غرقابی کو بہت پہلے دیکھ کر یہ فرمایا تھا:

دیارِ مغرب کے رہنے والو' خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو' وہ اب زرِ کم عیار ہو گا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا' ناپائیدار ہو گا!

(بانگ درا' مارچ ۱۹۰۷ء)

مشہورِ عالم فلسفی مؤرخ ٹائن بی نے اسی ضمن میں تحریر کیا تھا کہ:

''مسائل کو حل کرنے کی ہماری تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ ہم نے مادی ترقی کے حوالے سے لمبے لمبے قدم رکھتے ہوئے طویل فاصلے بڑی جلدی طے کر لئے ہیں لیکن اس ترقی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہم نے عورتوں کو بھی کام میں لگا کر اس قدر تھکا دیا ہے کہ وہ گھریلو زندگی کی جانب توجہ ہی نہیں دیتیں اور خود ان کے لئے تو صورت حال اتنی گھمبیر ہے کہ انہیں فیکٹریوں میں بھی کام کرنا پڑتا ہے اور گھر میں بھی۔ اپنی دہری مصروفیت کے باعث نہ تو وہ مثالی معاشی کارکن ہی بن سکی ہیں اور نہ ہی مثالی مائیں۔''

اس کے بعد وہ تحریر کرتا ہے کہ:

''جنگ عظیم کے بعد خواتین جس طرح معاش کے حصول کے لئے گھروں کو چھوڑ کر فیکٹریوں اور کارخانوں اور دفاتر کا رخ کر رہی ہیں وہ زیادہ امید افزا نہیں' اس لئے کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب بھی عورتوں نے معاشی حصول کے لئے گھروں کو ترک کیا وہ معاشرہ بکھر کر رہ گیا۔''

مشرقی عورت کے لئے لمحہ فکریہ

ٹائن بی کی یہ بات ہم اہلِ مشرق اور خاص طور پر ان خواتین کے لئے قابل غور ہے جو مغرب کی تحریک نسواں کی نقالی میں یہاں بھی ''آزادی'' کی متمنی ہیں اور مغرب کی نقالی میں' بینا ہوتے ہوئے بھی' نابینا بن کر ان خطرناک راستوں پر چلنے کی سعی میں مصروف ہیں جو بالآخر تباہی و بربادی پر اختتام پذیر ہوتے ہیں۔ مغرب کی تہذیب نے انیس صدیوں سے عورت کا جنسی' عمرانی' طبعی' روحانی اور معاشی غرض کہ زندگی کے ہر پہلو سے استحصال جاری رکھا ہوا ہے۔ جب مغرب کی عورت نے اس استحصال سے نجات حاصل کرنے کی سعی کی تو آزادی کے نام پر اہلِ مغرب نے اس کا مزید استحصال کیا۔ آج آزادی کے نام پر اس کی نسوانیت کو زخم زخم کیا جا رہا ہے حتیٰ کہ اُس سے اس کا عورت پن بھی چھین لیا گیا ہے۔ یہ بات سب کو جان لینی چاہئے کہ مغرب کی عورت ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں اس کی تمام بہنوں کو معاشرے میں بطورِ انسان اعلیٰ مقام وہی معاشرہ دے سکتا ہے جس کی بنیادیں حقیقی اقدار پر استوار کی گئی ہوں۔ یہ معاشرہ وہ ہوگا جس میں جاری نظامِ حیات نہ تو رہبانیت پر مشتمل ہوگا اور نہ ہی بے لگام جنسی آزادی اس معاشرے کا خاصہ ہوگی۔ لاریب اسلام ہی وہ نظام حیات ہے جو مَرد اور عورت کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیتا ہے اور جہاں پاکیزہ جنسی رویئے اور ان دونوں کے مابین رفاقت' چاہت اور زینت کے مطہر احساسات پیدا کر کے معاشرتی سکون اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی شکل میں نوعِ انسان کو مکمل امن فراہم کرنے کی ضمانت دی جاتی ہے۔

آج مغرب کی عیسائی عورت اپنے وجود کو منوانے کے لئے بے لگام آزادی کی خواہش مند ہے' لیکن عیسائیت کے برعکس جہاں اسے بطور انسان بھی قبول نہیں کیا جاتا' اسلام میں نہ صرف اس کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہے بلکہ عزت و احترام کے لحاظ سے اس کا ایک مقام متعین ہے۔ اسے نہ صرف وراثت میں شریک کیا گیا ہے (یاد رہے کہ عیسائیت میں اس کا تصور ہی نہیں) بلکہ ایک دائرہ کار میں رہتے ہوئے اسے آزادی کی نعمت سے بھی نوازا گیا ہے۔ عیسائیت کے برعکس جہاں اسے ساری عمر ایک ہی مَرد کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے پر مجبور کیا جاتا ہے' خواہ ان کا ساتھ رہنا ناممکن ہو چکا ہو' اسلام اس امر کی اجازت دیتا ہے کہ وہ شدید ناچاقی کی صورت میں خلع حاصل کر سکتی ہے۔ عیسائی مغرب نے عورت کو ازلی گناہ کا ذمہ دار قرار دے کر ذلت و رسوائی کے گڑھے میں اتارا ہوا ہے لیکن اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ: ﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ﴾ ''اور شیطان نے دونوں (آدم و حوا) کو بہکایا''۔ اسلام نے عورت کو

جو مقام و مرتبہ دیا ہے اسے بیان کرنے کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ تاہم جناب یسوع علیہ السلام کا اپنا قول ہے کہ ''درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے''۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ نہ صرف مغرب کی عورت بلکہ مَرد بھی روایتی مذہب سے بالکل برگشتہ ہو چکے ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ کوئی اخلاقی ضابطہ انہیں پسند نہیں آتا' اعلیٰ نصب العین سے وہ بیزار ہو چکے ہیں اور زندگی کے شب و روز کی مسرتوں ہی میں انہیں راحت ملتی ہے۔ عشرتِ امروز مغرب کا عقیدہ بن چکا ہے' خواہ اس کے حصول کے لئے کیسا ہی ناجائز حربہ کیوں نہ استعمال کیا جائے۔ مغرب کی تہذیب اب اس دور میں داخل ہو چکی ہے جو Decline of The West کے مصنف اسپنگلر کے الفاظ میں کسی تہذیب کی موت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

اہل یورپ کے لئے یہ حقیقت اس لئے بھی تلخ تر ہے کہ وہ یہ جان چکے ہیں کہ ان کا تمدن فنا کے ہاتھوں سے بچ نہیں سکتا اور جو کچھ اہل روم کے ساتھ ہوا اب بعینہٖ وہی حشر یورپ کا ہونے والا ہے۔ چنانچہ ان پر دمِ نزع طاری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان کے آج کے اعمال اس کے کل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یعنی جس قسم کے ہمارے اعمال ہوں گے اسی قسم کا ہمارا ''کل'' ہوگا اور اپنے آنے والے ''کل'' کا فیصلہ ہم نے خود کرنا ہے۔ دراصل صرف شمال ہی نہیں بلکہ خود عالم اسلام میں بھی اخلاقی و مذہبی اقدار کی عدم موجودگی کے باعث کُل نوعِ انسانی کی عمرانی حیات خلاؤں میں بھٹک کر رہ گئی ہے۔ اگر خدانخواستہ شمال و جنوب کے یہ خلا آپس میں ٹکرا گئے تو انسانیت تباہ ہو جائے گی۔ اس سے قبل کہ ہماری تہاذیب آپس میں ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں' ہمیں چاہئے کہ ایک صحیح نصب العین تلاش کر کے اپنے خلا کو پُر کریں۔ درحقیقت نوع انسانی کو ایک مرکز پر جمع کرنے کا ایسا نادر موقع کبھی نہیں آیا۔ اب ہمارا یہ فریضہ ہے کہ دنیا میں پھر سے وہ اقتدار قائم کریں جس سے گریز کا نتیجہ وہ فتنہ و فساد ہے جو ہماری زندگیوں میں داخل ہو گیا ہے۔

شب گریزاں ہوگی آخر.....!

اقوام عالم کا موجودہ اضطراب یقیناً ایک بہت بڑے روحانی و تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے اور اہل جنوب کے شب و روز اس امر کی گواہی دے رہے ہیں کہ ایک نئی عالمی تہذیب جنم لینے کو ہے۔ دُوررس نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ ہمیشہ کی طرح مشرق ہی سے روحانی نشاۃ ثانیہ کی تابناک کرنیں عالم افکار کو جگمگ کرنے کو ہیں۔ تاریخ بھی ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ عظیم الشان تہذیبیں اپنی روحانی نشاۃِ ثانیہ کے بعد ہی معراج کو پہنچی تھیں۔ نیز نوع انسان کی تاریخ

میں وہی ادوار شاندار رہے ہیں جن میں اعلیٰ نصب العین کے حصول کا جذبہ کارفرما تھا۔ لہٰذا اب جبکہ دنیا کا ایک مرکز پر آنا امر لازم بن چکا ہے اور ایک نئی تخلیق ہونے کو ہے، دنیا کی تمام اقوام کو چاہئے کہ وہ صلح صفائی اور باہمی رضامندی کے ساتھ عروجِ آدم کے لئے آزمائے جانے والے فرسودہ نظریات کے بجائے اس نسخۂ کیمیا کی جانب بھی توجہ کریں جس نے رنگ، نسل اور جنس کی تفریق سے بالاتر ہو کر ہمیشہ نوعِ انسانی کو ''یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ'' کہہ کر مخاطب کیا ہے۔

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہو گی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی!
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!

(اقبال: ''شمع''، بانگ درا)

سوئے حرم

اسباقِ عمرہ وحج

از: لطف الرحمٰن خان☆

عمرہ وحج کے ضمن میں تجربہ اور مشاہدہ سے کچھ سبق حاصل کیا ہے۔ چند باتیں ذہن میں آئی ہیں' انہیں اس دعا کے ساتھ قلم بند کر رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اپنے حبیب ﷺ کی اُمت کے لئے انہیں نافع اور مفید بنا دے اور اس کی نشر واشاعت میں حصہ لینے والوں کے لئے اسے ذخیرۂ آخرت بنا دے۔

اکثر اسباق کی نوعیت ایسی ہے کہ ان سے قبل اگر ہم کچھ بنیادی اور اصولی باتیں سمجھ لیں تو اصل سبق کو ذہن نشین کرنے میں آسانی ہوگی۔ اس لئے اصولی باتوں کو ہم ذیلی سرخی میں ''مقدمہ'' کا عنوان دیں گے۔ پھر اس کی مدد سے عمرہ وحج کے لئے جو بات سیکھنی مقصود ہے اسے ذیلی سرخی میں ''سبق'' کا عنوان دیں گے۔ اس وضاحت کے بعد اب ہم اللہ کا نام لے کر پہلا مقدمہ سمجھتے ہیں۔

مقدمہ ۱

قرآن مجید میں جہاں کہیں اللہ تعالیٰ نے کسی قانون یا اصول کا ذکر کیا ہے تو اکثر و بیشتر اس کے ساتھ ہی استثناء کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ اس کی متعدد مثالیں دی جا سکتی ہیں' لیکن ان شاء اللہ ایک ہی مثال کافی ہوگی۔ سورۃ البقرۃ اور سورۃ المائدۃ میں جہاں اللہ تعالیٰ نے سؤر کا گوشت حرام ہونے کا قانون بیان فرمایا ہے وہیں استثناء بھی بتا دیا ہے کہ اگر فاقوں کی وجہ سے جان پر بن آئے تو سؤر کا گوشت کھانے کی اجازت ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ بات خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ فاقوں کی حالت میں سؤر کے گوشت کو حلال نہیں کیا گیا ہے' اُس وقت بھی وہ حرام ہی رہتا ہے' البتہ ایسی حالت میں حرام کے استعمال کی رخصت دی ہے اور وہ بھی دو شرائط کے ساتھ۔ جو بھی ان شرائط کا

☆ سابق پرنسپل قرآن کالج لاہور

لحاظ کرتے ہوئے رخصت سے فائدہ اٹھائے گا اُس پر اُس وقت حرام چیز کے استعمال کا گناہ نہیں ہوگا۔ پہلی شرط یہ ہے کہ حرام استعمال کرتے وقت اللہ کے قانون سے بغاوت کا جذبہ موجود نہ ہو' بلکہ مجبوری کے احساس کے ساتھ رخصت سے فائدہ اٹھائے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ حد سے آگے نہ بڑھے' یعنی جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے جو کم سے کم خوراک ضروری ہے صرف اُسی پر اکتفا کرے اور سیر ہو کر نہ کھائے۔

اسی طرح حدیث کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ پانی پینے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ بیٹھ کر پیئے۔ لیکن آبِ زم زم مستثنیٰ ہے۔ اس کے پینے کا طریقہ یہ ہے کہ کھڑے ہو کر پیئے اور ہر گھونٹ کے بعد دعا مانگے۔ ضمنی طور پر یہ بھی نوٹ کر لیں کہ حضرت عمرؓ آبِ زم زم پیتے وقت یہ دعا مانگا کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ عِلْمًا نَّافِعًا وَّرِزْقًا وَّاسِعًا وَّشِفَاءً مِّنْ کُلِّ دَاءٍ

''اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں نفع بخش علم کا اور تیری عطا کی وسعت کا اور تمام (روحانی وجسمانی) بیماریوں سے شفا کا۔''

مذکورہ مثالوں سے یہ بات سمجھانی مقصود ہے کہ کوئی قاعدہ یا قانون کتنا ہی پکا یا محترم ہو' اس کے استثناء کی گنجائش ہمارے ذہن میں رہنی چاہئے۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو خود اپنے لئے غیر ضروری پریشانی اور کوفت کا سامان مہیا کریں گے۔ حضورﷺ نے ہدایت کی ہے کہ دین میں آسانی کرو اور لوگوں پر سختی نہ کرو۔ مذکورہ پہلو سے اگر ہمارے ذہن میں وسعت ہو گی تو نبی کریمﷺ کی اس ہدایت پر عمل کرنا ہمارے لئے آسان ہوگا۔

سبق ۱

بچپن سے ہمیں تربیت دی جاتی ہے کہ نمازی کے سامنے سے گزرنا گناہ ہے۔ ہمارے ذہنوں میں حدیث کا مفہوم بھی ہے کہ نمازی کے سامنے سے گزرنے کا نتیجہ اگر معلوم ہو تو انسان چالیس سال تک کھڑے رہ کر انتظار کرنا گوارا کر لے گا لیکن نمازی کے سامنے سے گزرنا گوارا نہیں کرے گا۔ اس ذہنی تربیت کے ساتھ جب کسی کو پہلی مرتبہ حرمین شریفین میں حاضری کی سعادت نصیب ہوتی ہے اور وہاں وہ لوگوں کو نمازیوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھتا ہے تو پریشان ہو جاتا ہے۔ اکثر لوگ غصہ کرتے ہیں اور ایک طرح کی ذہنی کوفت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ مکّہ اور مدینہ کے باشندوں کو اِس جرم کا ذمہ دار سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ غلط طرزِ فکر ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس قاعدہ کی ہم نے بچپن سے پابندی کی ہے اس کی استثنائی

کیفیت کے لئے ہمارا ذہن نہ تو تیار ہوتا ہے اور نہ ہی اسے قبول کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو حرمین شریفین لے جائے۔ وہاں پہنچ کر آپ دیکھیں گے کہ کس انداز میں اِن مساجد میں صف بندی ہوتی ہے۔ پھر آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ وہاں پر اس قاعدے کی پابندی عملاً ممکن نہیں رہتی۔ یہ حالت اضطرار ہے۔ اس مجبوری کے تحت مذکورہ قاعدہ پر عمل نہ کرنے کی رخصت ہے۔ اس سے استفادہ کرتے ہوئے ہمارے طرزِ عمل کے دو پہلو الگ الگ ذہن میں واضح رہنے چاہئیں۔

اولاً یہ کہ جب آپ نماز پڑھ رہے ہیں اس وقت خواہ سامنے سے سو آدمی گزر جائیں' آپ قطعاً پریشان نہ ہوں۔ یقین کریں آپ کی نماز میں رائی کے دانے کے برابر بھی نقص واقع نہیں ہوا ہے۔ البتہ اگر آپ پریشان ہوں گے اور اللہ کے مہمانوں کے خلاف دل میں کدورت پالیں گے تو پھر آپ کی نماز میں نقص پڑنے کا امکان پیدا ہو جائے گا۔

ثانیاً یہ کہ جب آپ نماز سے فارغ ہو گئے اور اب آپ کو باہر نکلنا ہے' اس وقت ایک لمحہ کے لئے توقف کر کے صورتِ حال کا جائزہ لے لیں اور نزدیک ترین راہ داری تک پہنچنے کے لئے کسی ایسی راہ کا انتخاب کر لیں کہ آپ کو کم از کم نمازیوں کے سامنے سے گزرنا پڑے اور بالکل سامنے سے گزرنے کے بجائے ممکنہ حد تک فاصلے سے گزریں۔ اس طرح آپ کے دل میں احساسِ مجبوری بھی برقرار رہے گا اور آپ حد سے تجاوز بھی نہیں کریں گے۔

مشاہدہ میں یہ بات آئی ہے کہ کچھ لوگ جب کئی مرتبہ حرمین میں حاضری کی سعادت حاصل کر لیتے ہیں تو اپنے محلوں اور شہروں کی مساجد میں بھی وہ نمازیوں کے سامنے سے گزرنے میں بے باک ہو جاتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل غلط ہے۔ ان مساجد میں حالت اضطرار ختم ہو جاتی ہے' اس لئے وہاں نمازی کے سامنے سے گزرنے پر گناہ لازم آتا ہے۔

سبق ۲

قرآن مجید کا احترام ایک مسلّمہ امر ہے اور کم از کم قرآن مجید کے احترام کی حد تک پاکستانی مسلمانوں کا رویہ قابل رشک ہے۔ اپنی مساجد میں جب ہم جوتی لے کر گزرتے ہیں اور کسی کو تلاوت کرتے دیکھتے ہیں تو جھک کر جوتی کو زمین کی سطح کے برابر کر کے گزرتے ہیں تاکہ اس کی سطح قرآن کی سطح سے بلند نہ ہو۔ یہ بالکل فطری بات ہے کہ جس کے دل میں قرآن کا جتنا احترام ہو گا وہ اس کی بے حرمتی دیکھ کر اتنا ہی چراغ پا ہو گا۔ اس لحاظ سے حرمین میں کچھ لوگوں کا چراغ پا ہونا سمجھ میں تو آتا ہے لیکن اس طرزِ عمل کو درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس کی وجہ یہی ہے کہ حرمین میں قرآن کا اس درجہ احترام قابل عمل نہیں ہے جیسا کہ ہم اپنے گھروں اور مساجد میں کرتے ہیں۔ اور یہ بات تو قطعاً ممکن نہیں ہے کہ آدمی ہاتھ میں جوتی لے کر حرمین میں سے گزرے اور اس کی سطح قرآن سے بلند نہ ہو۔ اس لئے اس ضمن میں رخصت سے استفادہ کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اب ہر شخص اپنی اپنی ذہنی سطح کے مطابق رخصت سے استفادہ کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں اگر ہم اللہ کے کچھ مہمانوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں تو اپنا ہی نقصان کرتے ہیں' اس لئے کہ اس طرح ہم غیبت جیسے گناہ میں ملوث ہوتے ہیں' جس کے گھناؤنے پن کا عالم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحجرات میں اسے مردہ بھائی کی لاش کا گوشت کھانے سے تشبیہہ دی ہے۔

مشاہدہ میں آیا ہے کہ ایک دو واقعات کو بنیاد بنا کر' اس میں نمک مرچ لگا کر اور اسے عمومیت کا رنگ دے کر کچھ لوگ حرمین میں قرآن کی بے حرمتی کے افسانے لوگوں کو سناتے پھرتے ہیں۔ یہ بہتان طرازی ہے جو غیبت سے بھی بڑا گناہ ہے اور حرمین میں حاضری کی سعادت سے جو کچھ حاصل ہوا ہے اسے ضائع کرنے والی بات ہے۔

صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ انسان اپنے مقدور بھر قرآن کے احترام کی کوشش کرتا رہے اور جہاں احترام ممکن نہ ہو اُس کے لئے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا رہے' دوسروں کے طرزِ عمل میں کیڑے نکالنے کی بجائے اپنی خیر مناتا رہے۔

مقدمہ ۲

اللہ تعالیٰ نے رمضان کے آخری عشرہ میں عمرہ کی سعادت نصیب کی۔ استلام کر کے طواف کی ابتدا کی۔ چند قدم ہی چلے تھے اور ابھی دل کو اللہ کے حضور حاضر کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ایک دھکا لگا اور ہم رائٹ ٹرن ہو گئے۔ ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ دوسرا دھکا لگا اور ہم لیفٹ ٹرن ہو گئے۔ چند قدم آگے بڑھے تھے کہ پیچھے سے دھکا لگا اور ہم سامنے والے پر جا پڑے۔ پھر ہوش آیا کہ یہ رمضان کا آخری عشرہ ہے' خود کو سنبھالو۔ چنانچہ اسی طرح دھکے کھاتے اور خود کو سنبھالتے ہوئے سات چکر پورے کر لئے۔ سعی میں بھی تقریباً یہی حال رہا۔ عمرہ پورا کر کے حرم میں بیٹھے حساب لگا رہے تھے کہ جو دعائیں مانگنے کا پروگرام بنایا تھا ان میں سے کون سی دعائیں مانگ پائے اور کون سی رہ گئیں۔ تو چند دعاؤں کے علاوہ کچھ یاد نہ آیا کہ کیا پڑھا اور کیا مانگا۔ طبیعت بجھ سی گئی۔ سوچنے لگا پتہ نہیں ہمارا یہ عمرہ قبول بھی ہوگا یا نہیں۔

عید مدینہ میں کر کے شوال کے پہلے ہفتہ میں مکہ واپس آ کر دوسرا عمرہ کیا۔ بھیڑ چھٹ چکی تھی۔ اطمینان سے طواف وسعی کے چکر پورے کئے۔ پروگرام کے مطابق دعائیں مانگیں۔ حضورِ قلبی کے چند لمحات بھی نصیب ہوئے۔ ایک دو بار آنکھیں بھی نم ہوئیں۔ عمرہ مکمل کر کے حرم میں بیٹھے تو دل میں اطمینان اور سرور کی کیفیت تھی۔ خیال آیا کہ ان شاء اللہ یہ عمرہ قبول ہوگا۔ پھر سوچا کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے میری غلطیوں اور کوتاہیوں کو معاف کرتے ہوئے دونوں عمرے قبول کر لے تو ثواب کس میں زیادہ ملے گا؟ دل کی تسلی کہتی تھی کہ شوال کے عمرہ میں زیادہ ثواب ملے گا۔ لیکن حضور ﷺ کا فرمان یاد آیا کہ رمضان کے عمرہ کا ثواب حج کے برابر ہے۔ ظاہر ہے کہ آپؐ کے فرمان کے سامنے دل کی تسلی کی کیا حیثیت ہے! یقین آ گیا کہ اگر دونوں عمرے قبول ہوئے تو ثواب تو رمضان کے عمرہ کا ہی زیادہ ہے۔

تب بات سمجھ میں آئی کہ حج اور رمضان کے عمرہ کے موقع پر اللہ کے مہمانوں کا اژدھام ہوتا ہے۔ اس لئے اس موقع پر اللہ نے اس رویہ کو عبادت کا جزو بنا دیا ہے کہ دوسروں کی بے احتیاطی سے جو تکلیف پہنچے اس سے درگزر کرو اور خود کو سنبھالو کہ تم سے دوسروں کو تکلیف نہ ہو۔ بلکہ یہ کہنا بھی غالباً مبالغہ نہیں ہوگا کہ ان مواقع پر عبادت کی روح یہی ''اکرامِ مسلم'' کا رویہ ہے۔

دوسری بات یہ سمجھ میں آئی کہ عبادت میں ثواب کے اضافہ کے لئے خشوع وخضوع اور اکرامِ مسلم دونوں ہی ضروری ہیں۔ لیکن اگر صورتحال ایسی ہو کہ دونوں کا یکجا ہونا ممکن نہ ہو تو اکرامِ مسلم پر خشوع وخضوع کو قربان کر دو۔ اس طرح ماحول میں جو ایک حسن پیدا ہوتا ہے وہ اللہ کو بہت پسند ہے۔

ضمنی طور پر یہ بات بھی نوٹ کر لیں کہ فریضہ حج کی ادائیگی کے بعد عمرے کرنا بہتر ہے۔ حج کو ملتوی کر کے عمرے کرنا خطرناک کام ہے۔ اس کی وضاحت کسی عالم دین سے حاصل کر لیں۔

سبق ۳

حجرِ اسود کو بوسہ دینے کے لئے کشتی لڑنے سے افضل یہ ہے کہ دُور سے استلام کر لے' طواف اور سعی کے چکروں میں اس بات کا خیال رکھے کہ ہم سے کسی کو دھکا یا ٹھوکر نہ لگے۔ دوسرے سے ہم کو تکلیف پہنچے یا کسی کا غلط عمل نظر آئے تو غصہ یا کدورت تو دور کی بات ہے' دل میں تنگی بھی محسوس نہ کرے' بلکہ اس کے لئے ہدایت کی اور اس کی عبادت کی قبولیت کی دل

میں دعا کرے۔ کیا پتہ اس کے طفیل اللہ تعالیٰ ہماری خطاؤں کو معاف کر کے ہماری عبادت قبول کر لے! اس احتیاط کے ساتھ جہاں کہیں ممکن ہو اللہ سے لو لگانے کی کوشش کرے اور طواف کے دوران یہ تصور کرے کہ خانہ کعبہ کے عین اوپر عرشِ معلّٰی ہے جس کا طواف فرشتے کر رہے ہیں اور اللہ اپنی دونوں مخلوقات کے طواف کو دیکھ رہا ہے۔ اس سے حضورِ قلبی میں بہت مدد ملتی ہے۔ نیز طواف کرتے وقت ایک حدیث کا یہ مفہوم بھی ذہن میں رکھیں کہ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جب کچھ لوگ اللہ کا ذکر کرنے جمع ہوتے ہیں تو اُن پر سکینت نازل ہوتی ہے' اللہ کی رحمت اُن پر چھا جاتی ہے' فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں اور مقرب فرشتوں سے اللہ ان کا ذکر کرتا ہے۔

سبق ۴

روانگی کے وقت سات دانوں کی ایک تسبیح بنا کر ساتھ لیتے جائیں۔ طواف وسعی میں ایک چکر پورا ہونے پر ایک دانہ کھسکا کر اگلے چکر کے لئے استلام کریں۔ اس طرح چکر کی گنتی یاد رکھنے سے ذہن فارغ ہو جائے گا۔

سبق ۵

طواف وسعی کے دوران لکھی ہوئی دعائیں کتاب میں سے دیکھ کر پڑھنا بھی خیر سے خالی نہیں ہے۔ ایسے لوگ ان سے یقیناً بہتر ہیں جو یہاں بھی باتیں کرتے ہیں یا دوسروں کا مذاق اڑانے یا تنقید کرنے جیسے گھناؤنے فعل میں ملوث ہوتے ہیں۔ لیکن زیادہ بہتر یہ ہے کہ روانگی سے قبل انسان تھوڑی سی محنت کر لے اور قرآن میں اللہ تعالیٰ کی تعلیم کردہ دعائیں اور نبی کریم ﷺ کی سکھائی ہوئی دعاؤں میں سے چند دعائیں ان کے معنی ذہن نشین کر کے یاد کر لے' پھر طواف وسعی کے دوران انہیں زبانی پڑھے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کی کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ قرآنی دعائیں اور مسنون دعائیں کتابی شکل میں بازار میں مل جاتی ہیں۔ مسنون دعاؤں کا ایک اچھا مجموعہ ''حصن حصین'' نامی کتاب میں موجود ہے۔ البتہ ہر چکر کے لئے جو مخصوص دعائیں بعض کتابوں میں ملتی ہیں' ان کا کوئی ثبوت نہیں۔

مقدمہ ۳

یاد دہانی کی غرض سے لکھ رہا ہوں' ورنہ یہ ایک معروف بات ہے۔ فرض نماز کے لئے اصول یہ ہے کہ دل میں رغبت ہو یا نہ ہو' طبیعت آمادہ ہو یا نہ ہو' دھیان لگے یا نہ لگے' نماز ہر

حال میں پڑھنی ہے۔ جب کہ نوافل کا اصول یہ ہے کہ جب تک رغبت رہے اور طبیعت میں آمادگی رہے نفل پڑھتا رہے۔ جب طبیعت ہٹ جائے تو چھوڑ دے۔ ان اصولوں کی روشنی میں ہم حرمین میں فرض اور نفل نمازوں کے لئے مختلف رویئے آسانی سے اختیار کر سکتے ہیں۔

سبق ۶

حرمین شریفین میں حج اور رمضان کے عمرہ کے دوران فرض نماز کی باجماعت ادائیگی ایک آزمائشی مرحلہ ہے اور آزمائش یہی ہے کہ اس موقع پر ہم صرف اپنی نماز کی فکر کرتے ہیں یا ہمیں اللہ کے دوسرے مہمانوں کی نماز کا بھی کچھ احساس ہے؟ اس موقع پر صرف اپنی نماز اور اس میں خشوع وخضوع کی فکر کرنا اور دوسروں کی نماز سے بے فکر ہو کر خود غرضی کا رویہ اختیار کرنا ناکامی کی علامت ہے، جبکہ نماز کے خشوع وخضوع کو اکرامِ مسلم پر قربان کر دینے میں کامیابی ہے۔

اس ضمن میں پاکستانیوں کی اکثریت کا رویہ اصلاح طلب ہے جبکہ انڈونیشی اور عربی بولنے والی اقوام کا رویہ قابل رشک ہے۔ یہ لوگ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جگہ دینے کی شعوری کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات صفوں میں دائیں بائیں سے اتنا دباؤ آتا ہے کہ سیدھا کھڑے ہونے کی بجائے ترچھے کھڑا ہونا پڑتا ہے جس کی وجہ سے ہمارا رُخ کعبہ کے دائیں یا بائیں جانب ہو جاتا ہے ـــــ صفوں کا درمیانی فاصلہ اتنا کم ہو جاتا ہے کہ سجدے کی جگہ نہیں رہتی اور اکثر اوقات سامنے والے کے قدموں میں یا اس کی کمر پر سجدہ کرنا پڑتا ہے۔ اس صورتِ حال سے ہمیں وحشت ہوتی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری نماز ٹھیک نہیں ہوتی۔ اگر ہمارے دل کو یقین ہو کہ اس طرح نماز میں کوئی نقص واقع نہیں ہوا تو پھر ہمارے لئے ''اکرامِ مسلم'' کا رویہ اختیار کرنا آسان ہو جائے گا۔

یہ یقین حاصل کرنے کے لئے مقدمہ ۲ کے نتائج پر دوبارہ غور کر لیں۔ لیکن اس کی آخری سند یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ بسا اوقات بڑے مجمع میں قرآن پڑھتے اور اس میں جب آیت سجدہ آتی تو آپؐ خود بھی سجدہ میں گر جاتے تھے اور جو شخص جہاں پر ہوتا وہیں سجدہ ریز ہو جاتا حتیٰ کہ کسی کو سجدہ کرنے کے لئے جگہ نہ ملتی تو سامنے والے شخص کی پیٹھ پر سجدہ کر لیتا۔ حرمین میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس عمل کو یاد رکھنے سے دل کو تقویت ملتی ہے۔

سبق ۷

حرمین میں سنتیں اور نوافل ادا کرنے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ جماعت ختم ہونے کے بعد چند منٹ ذکر و درود میں گزار لیں۔ اس دوران کافی لوگ دو رکعت نماز پڑھ کر جا چکے ہوں

گے اور جگہ میں کچھ کشادگی پیدا ہو چکی ہو گی۔ اب سکون و اطمینان سے نماز پڑھیں' اور یہ موقع ہے کہ جب نماز میں خشوع و خضوع حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

مناسب ہو گا کہ نوافل کے بعد اپنا احتساب بھی کر لے کہ کشادگی میں اور سکون سے نماز ادا کر کے اس نے کتنا خشوع و خضوع حاصل کر لیا جس کے لئے جماعت میں وہ اتنا بے چین تھا۔ میں جب اپنا احتساب کرتا ہوں تو میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے اور دل سے یہی آواز نکلتی ہے کہ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ (اور میری کوئی توفیق نہیں سوائے اللہ کی توفیق کے۔)

سبق ۸

ایک حدیث کے مطابق بیٹھ کر نماز پڑھنے سے ثواب آدھا ملتا ہے۔ بیماروں اور معذوروں کا بیٹھ کر نماز پڑھنا تو سمجھ میں آتا ہے اور اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ ان کی معذوری کے پیش نظر وہ ثواب میں کمی نہ کرے' لیکن کچھ لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ پوری نماز تو کھڑے ہو کر پڑھتے ہیں لیکن نوافل بیٹھ کر ادا کرتے ہیں۔ انہیں چاہئے کہ وہ اپنے ثواب کا حساب کر لیں۔ حرم مکّہ میں ایک رکعت کا ثواب ایک لاکھ رکعت اور مسجد نبویؐ میں ایک رکعت کا ثواب پچاس ہزار رکعت کے برابر ہوتا ہے' جب کہ رمضان المبارک میں اسے ۷۰ سے ضرب دے دی جاتی ہے۔ کسی مجبوری کے بغیر بیٹھ کر نفل پڑھنے والے کیا کھوتے ہیں اور کیا پاتے ہیں' اس کا حساب کرنا بہت مشکل نہیں ہے۔

سبق ۹

طواف وسعی کے بعد حرم میں کسی جگہ بھی دو رکعت نفل پڑھ لے تو نماز ہو جائے گی۔ صحن کعبہ میں مقام ابراہیم کا جو نشان بنا ہوا ہے اس کے پیچھے کسی جگہ بھی نماز پڑھ لے تو امید ہے کہ ثواب میں اضافہ ہو جائے گا۔ مذکورہ نشان کے زیادہ قریب ہو کر نماز پڑھنے سے ثواب میں مزید اضافہ ہو گا یا نہیں' اس کے متعلق یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ جو لوگ رش کے دوران نشان کے قریب نماز پڑھتے ہیں وہ طواف میں رکاوٹ اور طواف کرنے والوں کی تکلیف کا باعث بنتے ہیں۔ اس طرح ان کے ثواب میں کمی ہونا ایک یقینی امر ہے۔ ایسے لوگوں کو چاہئے کہ وہ ثواب میں ایسے مزید اضافہ کے لالچ میں جو کہ غیر یقینی ہے' وہ کام نہ کریں جس سے ان کے ثواب میں کمی یقینی ہو۔ یہ بات واضح رہے کہ خانہ کعبہ کا طواف بہت اہم عبادت ہے اور اس کے مقابلہ میں نفل نماز کو وہ اہمیت حاصل نہیں' بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ یہ نفل نماز حرم میں کسی جگہ بھی ادا کی جا سکتی ہے۔

مقامِ ابراہیم کے پیچھے نماز پڑھنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ اپنی نماز ادا کر کے وہاں سے اٹھ جائیں۔ نماز کے بعد وہاں بیٹھے رہنے سے وہ دوسرے مسلم بھائی کا حق غصب کرتے ہیں جو گناہ کا باعث ہے۔

سبق ۱۰

کچھ لوگ نماز سے کافی پہلے اس نیت سے حرم میں چلے جاتے ہیں کہ نماز کے لئے اچھی جگہ حاصل کر لیں۔ انہیں سوچنا چاہئے کہ جب جماعت کھڑی ہوتی ہے تو جلدی آنے والے اور دیر سے آنے والے برابر ہو جاتے ہیں اور سب ایک ہی حالت میں نماز پڑھتے ہیں' البتہ جلدی آنے والوں کے حصہ میں یہ کوفت ضرور آتی ہے کہ اتنی جلدی آئے پھر بھی سکون سے نماز نہ پڑھ سکے۔ اور چونکہ ثواب کا مدار نیت پر ہے اس لئے ممکن ہے کہ وہ حرم میں جلدی آنے کے ثواب سے محروم رہ جائیں۔ ایسے لوگوں کو چاہئے کہ وہ اپنی نیت درست کر لیں۔ حرم میں جلدی اس نیت سے جائیں کہ جتنی دیر وہاں بیٹھیں گے کعبۃ اللہ کو دیکھیں گے' نوافل ادا کریں گے اور تلاوت و ذکر و درود میں مشغول رہیں گے تو اس کا ثواب انہیں حاصل ہوگا۔ اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ اس نیت کا وہ انہیں ثواب دے گا' اگلی صف میں نماز پڑھنے کا اضافی ثواب ملے گا' اور جماعت تو جیسی ملنی ہے ویسے ہی ملے گی۔ یہ اُسی وقت ممکن ہے کہ اُن کے دل و دماغ میں اکرامِ مسلم کا جذبہ ہمہ وقت موجود رہے۔

مقدمہ ٤

ایک دن مَیں نماز ظہر کے بعد تلاوت کر رہا تھا۔ میرے برابر میں ایک عربی بولنے والے اللہ کے مہمان نے اپنی نماز مکمل کی اور وہیں اس طرح لیٹنے لگا کہ اس کے پاؤں کعبۃ اللہ کی طرف تھے۔ اس کے پیچھے ایک پاکستانی مہمان اس کو منع کر رہا تھا کہ کعبۃ اللہ کی طرف پاؤں نہ کرو' یہ گناہ ہے۔ کچھ تکرار کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوا اور پوچھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی عربی میں اس کو بتایا کہ پاؤں کعبۃ اللہ کی طرف مت کرو۔ اس نے مسکرا کر میرے پاؤں کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ تمہارے پاؤں کا تلوہ تو زمین کی طرف ہے مگر پاؤں کا رُخ کعبۃ اللہ کی طرف ہے اور نماز میں ہم سب کے پاؤں کا رُخ کعبۃ اللہ کی طرف ہوتا ہے۔ پھر اُسی طرح کعبۃ اللہ کی طرف پاؤں کر کے لیٹ گیا۔ اب وہ پاکستانی مہمان میرے پیچھے پڑ گئے کہ اسے روکو اور منع کرو۔ چند سیکنڈ میں نے ان کی آنکھوں سے نکلنے والی چنگاریوں کے بجھنے کا انتظار کیا' پھر ان کو سمجھایا کہ آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ آپ

کی بات اس تک پہنچ گئی ہے اور اس کی سمجھ میں آ گئی ہے۔ اس طرح آپ کا ثواب پکا ہو گیا۔ اب بات ماننے یا نہ ماننے کا اختیار اسے اللہ تعالیٰ نے دیا ہے تو اللہ کے دیئے ہوئے اختیار کو آپ سلب کرنے کی کوشش نہ کریں اور اپنی بات منوانے کی ضد چھوڑ دیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ انہوں نے میری بات مان لی۔ جھگڑا ختم ہو گیا اور امن دوبارہ قائم ہو گیا۔

سبق ۱۱

کعبۃ اللہ کی طرف پاؤں کر کے لیٹنے کی دلیل کس حد تک درست یا غلط ہے' اس پر تو کوئی عالم دین ہی روشنی ڈال سکتا ہے۔ لیکن اس واقعہ نے ذہن میں اصلاح کے صحیح رویہ اور اس کی اہمیت کی یاد تازہ کر دی۔ درست رویہ یہی ہے کہ اپنی بات سمجھانے کے بعد دوسروں کو فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے اور اپنی بات منوانے کی ضد نہ کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو بھی اسی کی تعلیم دی اور آپؐ کو بتایا کہ آپؐ کی ذمہ داری بس اتنی ہے کہ ہدایت لوگوں تک پہنچا دیں' انہیں سمجھا دیں اور اس پر عمل کر کے لوگوں کو دکھا دیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ اطمینان دلایا ہے کہ جہنم میں جانے والوں کے متعلق آپؐ سے نہیں پوچھا جائے گا۔ مراد یہ ہے کہ ہدایت پر عمل نہ کر کے جو لوگ جہنم کے مستحق قرار پائیں گے ان کے متعلق حضور ﷺ سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ آپؐ نے انہیں صحیح راستہ پر کیوں نہیں چلایا۔ تاکید مزید کے طور پر اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا کہ ہم نے آپؐ کو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا۔

اللہ تعالیٰ اگر ہمیں دوسروں کی اصلاح کرنے کی توفیق دے اور بالخصوص اگر حرمین شریفین میں یہ سعادت نصیب ہو تو ہمیں اس ضمن میں اللہ تعالیٰ کی اس تعلیم کو نہیں بھولنا چاہئے جو اس نے اپنے حبیب ﷺ کو دی تھی اور پوری احتیاط کرنی چاہئے کہ اس نیک کام میں ہم حد سے آگے نہ بڑھیں۔

سبق ۱۲

اگر ہم اصلاح کا درست رویہ اختیار کر لیں اور دوسروں کو اپنی بات سمجھانے کے بعد انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں تب بھی ایک مزید احتیاط کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ اپنی غلطی پر اصرار کرنے والوں کو اپنے سے حقیر ہرگز نہ جانیں۔

حضور ﷺ نے ہم کو خبر دی ہے کہ ایک انسان ساری عمر نیک اعمال کرتا رہتا ہے' یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے اور پھر وہ جہنم میں جا پڑتا ہے۔ جبکہ ایک دوسرا انسان ساری عمر بُرے اعمال کرتا رہتا ہے' یہاں تک کہ اس کے اور

جہنم کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا اور پھر وہ جنت کا حقدار ہو جاتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ نیک اعمال کرنے والا کسی وقت کوئی غلط موڑ کاٹ لیتا ہے اور اپنی اصلاح کرنے کے بجائے اسی غلط راہ پر گامزن رہتا ہے اور بالآخر جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے—— اس کے برعکس ساری عمر کے گناہوں میں لت پت انسان کو اصلاح کی توفیق نصیب ہو جاتی ہے اور پھر وہ اپنی اصلاح کرتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ جنت کا مستحق ہو جاتا ہے۔

اس لئے ہمیں ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہئے اور کسی بھی خطا کار یا گناہ گار کو خود سے کم تر یا حقیر نہیں جاننا چاہئے—— اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ دوسروں کے بجائے اپنے اعمال کی فکر کریں اور اپنے جذبات و خیالات میں جھانک کر دیکھتے رہیں کہ ہمارے اندر کوئی غلط جذبہ یا خیال تو پرورش نہیں پا رہا ہے۔ خاص طور پر دوسروں کی اصلاح کی کوشش کے فوراً بعد اس عمل کو دہرانا بہت ضروری ہے۔

عین ممکن ہے کہ ہماری اصلاح کی کوشش کا فوری نتیجہ سامنے نہ آئے لیکن بعد میں ہمارا ہی اصلاح کا ڈالا ہوا یہ بیج کسی وقت پھوٹ پڑے اور اسے اصلاح کی توفیق نصیب ہو جائے اور وہ شخص جنت کا مستحق قرار پائے۔ برخلاف اس کے وقتی طور پر ہماری اصلاح کو ٹھکرانے کی وجہ سے ہم نے اسے حقیر اور جہنمی جانا' اس طرح ہمارے اندر تکبر کا جو بیج پڑ گیا' وہ رفتہ رفتہ ایک تناور درخت بن جائے اور ہمیں جہنم کا مستحق بنا دے۔

اس حقیقت کو ہمیشہ ذہن میں واضح رکھیں کہ انسان کا کام صرف بیج ڈالنا ہے جبکہ بیج کو پھاڑنا اللہ تعالیٰ کا عمل ہے۔ نیز یہ فیصلہ کرنا کہ کون سا بیج پھوٹے گا' کب پھوٹے گا' پودا بننے اور درخت بننے میں کتنا وقت لے گا اور کتنے عرصہ کے بعد اس میں پھل اور پھول آئیں گے' یہ تمام امور کلیۃً اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ اس لئے ہمیں چاہئے کہ ہم اصلاح کے بیج بکھیرتے چلے جائیں اور باقی امور فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیں۔

مقدمہ ۵

تکبر اور شرک میں دو اعتبارات سے بہت مشابہت ہے۔ اوّلاً یہ کہ شرک کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ شرک ہرگز معاف نہیں کرے گا' اس کے علاوہ وہ جو چاہے گا اور جس کے لئے چاہے گا معاف فرمائے گا۔ جب کہ تکبر کے لئے حضور ﷺ نے اعلان کر دیا ہے کہ جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہو گا وہ جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا۔

ثانیاً یہ کہ شرک انسان کی سوچ میں اتنے غیر محسوس طریقے سے داخل ہوتا ہے کہ انسان کو اس کا احساس نہیں ہوتا۔ حضور ﷺ نے اس کی مثال دی ہے کہ شرک کو پہچاننا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کسی تاریک رات میں کسی سیاہ پتھر پر چیونٹی کو رینگتے ہوئے دیکھنا۔ تکبر کی بھی یہی صفت ہے اور یہ عام مشاہدہ والی بات ہے کہ تکبر کرنے والوں کو بالعموم اپنے تکبر کا احساس نہیں ہوتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ انسان ایمان کی ان دونوں دیمکوں سے ہر وقت چوکنا رہے۔

سبق ۱۳

حرمین شریفین میں قدم قدم پر اس بات کا امکان رہتا ہے کہ ہماری ایمان کی پونجی میں تکبر کی دیمک لگ جائے۔ اس کے دو امکانات ہیں۔ اوّلاً یہ کہ جب انسان سوچتا ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے مجھے کہاں پہنچا دیا' اُس وقت اپنے اندر جو جذبہ محسوس کرتا ہے وہ تو جذبہ شکر ہے' لیکن اسی میں تکبر کی غیر محسوس آمیزش بھی ہوتی ہے۔ جس طرح زمین سے نکلنے والے سونے میں ملاوٹ ہوتی ہے اور خالص سونا حاصل کرنے کے لئے اسے آمیزش سے پاک کرنا پڑتا ہے' اسی طرح جذبۂ شکر کو بھی تکبر کی آمیزش سے پاک کرنا ضروری ہے۔ اس کی عملی شکل یہ ہے کہ کبھی یہ نہ سوچئے کہ میں نے اتنی بھاگ دوڑ کی' فلاں فلاں موقعوں پر عقلمندی سے کام لیا اور اتنی مشکلات اور تکالیف برداشت کیں' تب جا کر یہاں پہنچا۔ جب بھی اس قسم کا شیطانی وسوسہ ذہن میں آئے تو اسے ردّ کر دے اور خود کو بار بار یاد دہانی کراتا رہے کہ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ ''یہ تو خالصتاً اللہ کا فضل ہے' وہ دیتا ہے جس کو وہ چاہتا ہے''۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام والی یہ دعا پڑھ لے:

رَبِّ اَوْزِعْنِیْ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰہُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِکَ فِیْ عِبَادِکَ الصّٰلِحِیْنَ

''اے میرے ربّ! تو میری قسمت میں دے کہ میں شکر ادا کروں تیری نعمت کا جو کہ تو نے انعام کی مجھ پر اور میرے والدین پر' اور یہ کہ میں ایسا نیک کام کروں جس سے تو راضی ہو' اور تو داخل کر مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں۔''

دوسرا امکان اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم اللہ تعالیٰ کے دوسرے مہمانوں کو اپنی دانست میں غلط کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں یا زیادہ ثواب حاصل کرنے کے مواقع کو ضائع کرتے ہوئے دیکھتے ہیں' مثلاً حرم میں دیر سے آنا' حرم میں یا طواف وسعی کے دوران آپس میں باتیں کرنا وغیرہ وغیرہ۔ عین ممکن ہے کہ اس وقت ہم خود کو اُن سے بہتر سمجھنے لگیں اور ایسے

لوگوں کو حقیر جانیں۔ یہی حقیقتاً تکبر کا وہ بیج ہے جو کسی وقت بھی پھوٹ کر تناور درخت بن سکتا ہے۔ ایسے موقعوں پر یہ بات ذہن میں تازہ کرلیں کہ ان لوگوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے خصوصی دعوت نامہ بھیجا تھا تب ہی وہ یہاں تک پہنچے ہیں۔ اس لئے یقیناً ان کے اندر کوئی ایسی پوشیدہ خوبی ضرور موجود ہے جو اللہ جانتا ہے اور ہم نہیں جانتے۔

مقدمہ ٦

تیس رمضان یعنی چاند رات کو مدینہ منورہ پہنچے۔ کمرہ کوئی خالی نہیں تھا۔ ہوٹل والے نے کہا کہ ایک رات ہوٹل کی چھت پر گزار لیں' کمرہ کل خالی ہو جائے گا۔ ہم نے ہامی بھر لی۔ ہوٹل کی چھ منزلہ عمارت کی چھت پر ایک المونیم کا کمرہ بنا ہوا تھا جس میں اس نے بستر لگا دیا اور ایک ہلکا سا کمبل دے دیا اور ہم سو گئے۔ رات تقریباً ڈھائی بجے سردی کی وجہ سے آنکھ کھل گئی۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک ہم کروٹ بدل بدل کر اور ہر طرف سے کمبل لپیٹ کر سردی کم کرنے اور سونے کی کوشش کرتے رہے' لیکن سردی میں اضافہ ہوتا رہا اور اسی تناسب سے تکلیف کا احساس بھی بڑھتا رہا۔ اُس وقت صحیح معنوں میں خدا یاد آیا اور ہم نے بلبلا کر اسی کو پکارا۔ پھر عقل نے کام کیا اور بیڈ کور کو کمبل کے ساتھ ملا کر لپیٹا تو کچھ سکون محسوس ہوا۔ فجر اور عید کی نماز کو جانے کے لئے کپڑے بدل کر بیڈ کور لپیٹ لیا۔ مسجد نبویؐ کے باہر میدان میں جگہ ملی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آ رہے تھے لیکن سردی کی تکلیف نہیں تھی۔ سوچا کہ اس بیڈ کور نے مجھے سردی سے بچایا ہوا ہے۔ اسی وقت قرآن مجید کی اُن آیات کا مفہوم ذہن میں آیا جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جب تمہاری کشتی طوفان میں پھنستی ہے تو خالصتاً اللہ کو پکارتے ہو اور جب خشکی پر پہنچ جاتے ہو تو شرک کرنے لگتے ہو۔ بات سمجھ میں آ گئی کہ آج کے دور میں اس غیر محسوس شرک کی نوعیت یہی ہے کہ ہم مادّی ذرائع و اسباب کو اپنا حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ لیتے ہیں اور فاعل حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات اس وقت ہماری نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

سبق ۱۴

حرمین شریفین میں قیام کے دوران اللہ کے تقریباً ہر مہمان کو کسی نہ کسی نوعیت کی آزمائش سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ بالعموم یہ آزمائش وقتی ہوتی ہے۔ اس طرح وہاں قیام کے دوران خوف اور اَمن کی کیفیتیں باری باری آتی جاتی رہتی ہیں۔

خوف کے بعد امن کی حالت میں انتہائی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ جب بھی ذہن

میں یہ خیال آئے کہ فلاں صاحب نے بروقت مدد کی' فلاں ترکیب کارگر ہوگئی یا فلاں دوا کام کرگئی' اس وقت لازماً اس حقیقت کو یاد کرے کہ اللہ کا حکم ہوا تب فلاں صاحب نے مدد کی یا فلاں چیز کارگر ہوئی' اگر اس کا حکم نہ ہوتا تو نہ ہی فلاں صاحب مدد کر سکتے تھے اور نہ ہی کوئی دوا یا ترکیب کارگر ہو سکتی تھی۔

سبق ۱۵

حج یا عمرے پر جاتے وقت ہم جو تلبیہ پڑھتے ہیں اس کے الفاظ پر غور کریں۔ اُس میں ہم بتکرار اس حقیقت کا اعتراف اور اعلان کرتے ہیں کہ اے اللہ! میں حاضر ہوں' تیرا کوئی شریک نہیں۔ مراد یہ ہے کہ میں اپنا گھربار' کاروبار' وطن اور اپنا آرام سب کچھ چھوڑ کر حاضر ہو گیا ہوں۔ اس لئے کہ تیری محبت میں مَیں دنیا کی کسی محبت کو شریک نہیں کرتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر پہلو سے اللہ کی وحدانیت کا اعتراف اور شرک کا ابطال اس عبادت کی روح ہے۔ اس لحاظ سے سبق ۱۴ میں مذکورہ احتیاط کی اہمیت ہمارے ذہن میں واضح ہو جانی چاہئے۔

سبق ۱۶

اس بات پر آپ کو تعجب ہوگا' لیکن حقیقت یہی ہے کہ آزمائش میں مبتلا ہونا بھی مقامِ شکر ہے۔ جب کسی طالب علم کو اگلی کلاس میں ترقی دینی ہوتی ہے تو پہلے اس کا امتحان لیا جاتا ہے اور صرف پاس ہونے والے طلبہ کو ترقی دی جاتی ہے۔ نیز صرف ایسے طالب علموں کو امتحان میں بیٹھنے کی اجازت ملتی ہے جن کی کلاس میں حاضری پوری ہو اور ہوم ورک تسلی بخش ہو' اس طرح ہمارے ذہن میں یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ اگر اللہ تعالیٰ آزمائش کے لئے ہمارا انتخاب کرتا ہے تو یہ مقامِ شکر ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ اپنے ربّ کے لئے دل میں جذبۂ تشکر کے ساتھ آزمائش میں پورا اترنے کی کوشش کریں اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس امتحان میں پاس کرے۔

مقدمہ ۷

ایک حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اختلافِ رائے کو اپنی اُمت کے لئے رحمت قرار دیا ہے۔ فرمانِ رسولؐ ہونے کی وجہ سے دل کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا رہتا تھا کہ اختلاف میں یقیناً رحمت ہے' لیکن ذہن میں یہ الجھن بھی تھی کہ اس رحمت کی عملی شکل اور اس کے ظہور کی نوعیت کیا ہے۔ مسجد نبویؐ میں مغرب کی نماز کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے

کی صف میں دو پاکستانی مہمان آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ چونکہ یہ لوگ دین کو سمجھنے سمجھانے کی بات کر رہے تھے اس لئے میرے کان بھی اُدھر ہی لگے ہوئے تھے۔ ایک مہمان نے پوچھا کہ یہاں مختلف لوگ مختلف طریقوں سے نماز پڑھتے ہیں' سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کی نماز درست ہے اور کس کی غلط ہے۔ دوسرے نے اسے سمجھایا کہ سب کی نمازیں درست ہیں۔ بات یہ ہے کہ حضور ﷺ نے مختلف وقتوں میں مختلف طریقوں سے نمازیں پڑھی ہیں۔ اللہ کو یہ منظور نہیں تھا کہ اس کے حبیب ﷺ کی کوئی بھی سنت ختم ہو۔ اس لئے اس نے ایک گروہ کو ایک طریقے پر اور دوسرے گروہ کو دوسرے طریقے پر لگا دیا ہے تاکہ حضور ﷺ کی ہر سنت تا قیامت زندہ رہے۔ یہ بات سن کر میرے ذہن کی الجھن دُور ہوگئی اور اختلافِ رائے کی رحمت کا ایک عملی پہلو میرے ذہن میں واضح ہوگیا۔

سبق ۱۷

جب آپ حرمین پہنچیں گے تو آپ لوگوں کو اتنے مختلف طریقوں سے نماز پڑھتے دیکھیں گے کہ پاکستان میں اس کا تصور ممکن نہیں ہے۔ اس وقت دو احتیاطیں لازمی ہیں۔ اولاً یہ کہ اس صورت حال سے پریشان ہو کر کسی ذہنی خلفشار کو اپنی نماز میں خلل ڈالنے کا سبب نہ بنائیں۔ ثانیاً یہ کہ دوسروں کی نمازوں کو غلط یا اپنی نمازوں سے کم تر سمجھ کر اپنے ذہن میں تکبر کی آبیاری نہ کریں۔

سبق ۱۸

پاکستان میں جس طرح ماہ رمضان میں ہم نماز وتر باجماعت ادا کرتے ہیں اسی طرح حرمین میں بھی تراویح کے بعد وتر باجماعت ادا کئے جاتے ہیں۔ البتہ دونوں جگہ وتر پڑھنے کے طریقے مختلف ہیں۔ اس اختلاف کی وجہ سے کچھ پاکستانی مہمان نماز عشاء اور تراویح تو امامِ حرم کے پیچھے پڑھتے ہیں لیکن وتر انفرادی طور پر پڑھتے ہیں۔ انہیں یہ سوچنا چاہئے کہ یہ دونوں طریقے مسنون ہیں۔ اس لئے نماز وتر کسی طرح بھی پڑھی جائے ان شاء اللہ ثواب میں کمی نہیں ہوگی' البتہ امامِ حرم کی امامت اور حرم کی جماعت چھوڑ کر انفرادی نماز پڑھنے سے ثواب میں کمی کا ہونا لازمی امر ہے۔

استدعا

ان چند گزارشات کے بعد آمدم برسر مطلب۔ آپ سے درخواست ہے کہ اپنے سفر

مبارک میں قرآن کالج کو خصوصی طور پر یاد رکھیں اور ہر مقام پر اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ اس ادارے کو علم دین کی اشاعت کا گہوارہ بنا دے' نیز وہ اسے اقامت دین کی جدوجہد اور دنیا میں غلبۂ اسلام کا منبع و سرچشمہ بنا دے۔ اس ادارے کے تمام سٹاف اور اس کے معاونین کے لئے بھی دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ انہیں دنیا و آخرت کی خیر اور بھلائی نصیب کرے۔ ہماری پُرخلوص دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سفر مبارک میں ہر مقام پر آپ کو زیادہ سے زیادہ عباداتِ مقبولہ نصیب کرے اور وہاں کی اپنی تمام برکتوں اور نعمتوں سے آپ کو نواز دے۔ آمین!

جذبِ دروں' شوقِ زیارت اور عقیدت و محبت سے معمور

زیارتِ حرمین شریفین کی روداد

شوقِ حرم

از قلم:

عتیق الرحمٰن صدیقی (ہری پور)

تقدیم: حافظ محمد ادریس

(نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان)

زائرین حرمین شریفین کے لئے ایک راہنما کتاب

دیدہ زیب ٹائٹل' سفید کاغذ' عمدہ طباعت

صفحات 100 ' قیمت: 45 روپے

ملنے کا پتہ: **مکتبہ نور اسلام**

رحمٰن مارکیٹ' غزنی سٹریٹ' اردو بازار لاہور' فون: 7352847

میرے ابّا جان

ایک سلیم الفطرت انسان

تحریر: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

محمد یونس جنجوعہ نے ۲۰ سال کی عمر میں پرائمری سکول ٹیچر کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ والدین کے بھرپور تعاون نے انہیں موقع دیا کہ وہ تعلیمی قابلیت میں اضافہ کرتے رہیں۔ انہوں نے میٹرک کے بعد پرائیویٹ طور پر ایف اے، بی اے، سی ٹی، بی ایڈ، ایم اے فاضل پرشین کے امتحانات پاس کئے۔ بعدازاں پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایڈ کیا۔ پھر لیکچرر رہوئے۔ چالیس سال درس وتدریس میں گزار کر ۲۰۰۱ء میں ریٹائر ہوئے۔ آج کل قرآن اکیڈمی لاہور میں ادارتی معاون کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

نام فیروز دین تھا۔ والد کا نام فضل دین۔ ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ والد سکول ٹیچر تھے۔ ان کا سکول گھر سے میلوں دور تھا جہاں ہر روز پیدل آتے جاتے تھے۔ میرے والد دو بھائی تھے۔ بڑے بھائی کا نام مہتاب دین تھا۔ دو بہنیں بھی تھیں۔ میرے والد اپنے ماں باپ کی اولاد میں سے سب سے چھوٹے تھے۔ ابھی آپ عمر کے ابتدائی سالوں میں تھے کہ ماں اور باپ دونوں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ان کا ایک چچا تھا، اس کے زیر کفالت آ گئے۔ چچا بڑا سخت گیر تھا۔ والد صاحب انہیں دعائیں دیتے تھے کہ ان کی سختی نے میرے جسم سے سستی اور کاہلی نکال دی۔ جب وہ صبح جگانے کے لئے آواز دیتے تو پہلی آواز پر ہی نہایت چستی کے ساتھ انہیں جواب دینا ہوتا تھا۔ عسرت اور ناداری کا دور تھا۔ چچا کی اپنی اولاد بھی تھی۔ حالات کی مجبوری کے تحت کسی کو بھی سکول نہ بھیج سکے، ہر ایک کو چھوٹے موٹے کام پر لگا دیا۔ یوں میرے والد صاحب بھی ناخواندہ رہ گئے۔ بعدازاں جب جوان ہوئے تو پڑھنے لکھنے کا شوق ہوا۔ ابتدائی قاعدہ لیا اور جاننے والے دوست احباب سے سبق لے لیا کرتے۔

چنانچہ انہوں نے معمولی لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔ پڑھ تو خوب لیتے تھے مگر لکھنا صرف کام چلانے کی حد تک جانتے تھے۔ جب ہم نے بڑے ہو کر انہیں لکھتے دیکھا تو ہم ہنستے تھے نصیر کو ''نسیر'' اور قیصر کو ''کیسر'' لکھتے تھے۔ ہمیں ہنستا دیکھ کر کہتے کہ میں نے کون سا سکول میں پڑھا ہے' میں تو بس اپنا کام چلا لیتا ہوں۔

میرے والد اور تایا کا اتفاق مثالی تھا۔ دونوں ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ دونوں صاحب اولاد ہوئے۔ بیٹیاں بڑی ہو گئیں۔ ان میں سے بعض کی شادیاں بھی ہو گئیں۔ مگر دونوں ایک ہی جگہ رہتے اور کھاتے پیتے تھے۔ والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ ہم دونوں بھائیوں کی بیٹیاں ہی تھیں۔ عزیزوں رشتہ داروں نے ہمیں مجبور کیا کہ دونوں بھائی الگ الگ رہائش کر لو' کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اولادِ نرینہ سے نوازے۔ چنانچہ دونوں بھائی بادلِ نخواستہ الگ ہوئے۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے دونوں کو اولادِ نرینہ سے نوازا۔

لڑکیوں کے بعد میرے تایا کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا اور پھر تایا جان اللہ کو پیارے ہو گئے۔ میرے والد کے ہاں چار بیٹے ہوئے جن میں مَیں سب سے بڑا ہوں۔ بھائی کی وفات کے بعد میرے والد صاحب نے اپنی بیوہ بھابی اور اکلوتے بھتیجے کو زیرِ کفالت لینا چاہا مگر انہوں نے قبول نہ کیا۔ بعد ازاں جب تایا زاد بھائی جوان ہوا تو اسے ہم بھائیوں کے ساتھ خواہ مخواہ کا حسد ہو گیا۔ میرا یہ تایا زاد عمر میں مجھ سے بڑا تھا۔ چھوٹی کلاسوں میں مجھ سے آگے تھا۔ تعلیم کے ساتھ اسے دلچسپی نہ تھی اس لئے مڈل کا امتحان بھی پاس نہ کر سکا۔ جبکہ میں بھی اسی سکول میں پڑھتا تھا اور پڑھائی میں ہوشیار تھا۔ پرائمری میں میں نے وظیفہ کا امتحان پاس کیا اور وظیفہ لیا۔ پھر مڈل کا امتحان پاس کیا تو نمایاں پوزیشن حاصل کی اور وظیفہ لیا۔ اسی طرح میرا چھوٹا بھائی محمد یعقوب ضیاء بھی پڑھائی میں تیز تھا۔ یہ چیز بھی ہمارے تایا زاد کے لئے حسد کا باعث بنی۔ ہم دونوں بھائی میٹرک کے بعد جب نوکری پر لگ گئے تو اُس کا حسد مزید بڑھا اور اس نے ہمیں اور ہمارے والد صاحب کو خواہ مخواہ پریشان کرنا شروع کر دیا۔ ہم دونوں بھائی لاہور میں ملازم تھے اور دفتری اوقات کے بعد پرائیویٹ طور پر بی اے کی تیاری بھی کر رہے تھے۔ گاؤں سے جب تایا زاد کے ہاتھوں والد صاحب کی پریشانی کی اطلاع ملتی تو ہمیں بھی غصہ آتا' مگر اللہ تعالیٰ نے ہماری راہنمائی کی اور ہمارے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس پریشانی سے جان چھڑانے کے لئے تایا زاد سے صلح کر لیں تاکہ ذہنی سکون کے ساتھ اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں۔ چنانچہ برادری کے چند شرفاء کے ذریعے ہم نے اپنے تایا زاد کو صلح پر

مجبور کر دیا اور دب کر اس سے صلح کر لی۔ اس کے بعد ہم دونوں بھائی پوری دل جمعی کے ساتھ پڑھائی میں لگ گئے اور دونوں نے بی اے کر لیا۔ بعد ازاں ایم اے بھی کر لیا' مگر ہمارا تایا زاد ناخواندہ رہ گیا اور معمولی سے کاروبار میں لگ گیا۔

میرے والد صاحب کو تعلیم کا بہت شوق تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میرے بچے تعلیم پا کر سرکاری ملازمت میں آئیں' مگر وسائل کی کمی آڑے آ رہی تھی۔ ہم دونوں بھائیوں نے یکے بعد دیگرے گاؤں سے مڈل کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ گاؤں میں اُس وقت ہائی سکول نہ تھا [اب ڈگری کالج موجود ہے] میٹرک کرنے کے بعد شیخوپورہ آنا پڑا۔ چنانچہ ہم دونوں بھائیوں نے اوّل درجے میں میٹرک پاس کر لیا۔ ہم آگے پڑھنا چاہتے تھے مگر والد صاحب ہماری مزید تعلیم کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے تھے اور قرض لینے سے وہ انتہائی گریزاں تھے' لہٰذا ہمیں تعلیم کو خیرباد کہنا پڑا۔ مجھے تو انہوں نے گورنمنٹ نارمل سکول گکھڑ میں ایس وی ٹیچر کی تربیت کے لئے داخل کروا دیا جبکہ چھوٹا بھائی اے جی آفس میں جونیئر کلرک لگ گیا۔ میری تربیت مکمل ہوئی تو مجھے گورنمنٹ ہائی سکول ننکانہ صاحب میں ملازمت مل گئی۔ ۴ نومبر ۱۹۶۰ء سے میری ملازمت شروع ہو گئی' جبکہ میری شادی اس سے چند ماہ پہلے ۲۰ سال کی عمر میں ہی ہو چکی تھی۔ میں نے ایف اے کی تیاری شروع کر دی۔ میری بیوی اور بعد ازاں میرے بچوں کی نگہداشت اور پرورش کا ذمہ میرے والد صاحب نے اٹھایا اور مجھے اس بوجھ سے آزاد کر دیا تاکہ میں سکون کے ساتھ حصولِ تعلیم میں لگ سکوں۔ چنانچہ اگلے سال ۱۹۶۱ء میں مَیں نے پرائیویٹ طور پر بغیر کوئی اکیڈمی جائن کئے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کر لیا۔ [اُس وقت اکیڈمیوں کا رواج ہی نہ تھا' اپنے اساتذہ سے پرائیویٹ ٹیوشن البتہ تھی مگر وہ بھی خال خال] بی اے کی تیاری شروع کی تو انگلش خاصی مشکل تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ ننکانہ میں رہ کر بی اے نہیں ہو سکے گا چنانچہ لاہور تبادلے کی کوشش کی۔ لاہور تبادلہ بہت ہی مشکل تھا مگر والدین کی دعائیں اور تمنائیں رنگ لائیں کہ میرا تبادلہ گورنمنٹ ہائی سکول باغبان پورہ میں ہو گیا۔ میں نے لکشمی چوک میں پروفیسر نیاز محمد رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں پرائیویٹ ٹیوشن شروع کر دی۔ ہم دونوں بھائیوں نے باغبانپورہ میں اکٹھی رہائش رکھ لی اور وہاں سے ہر روز شام کے اوقات میں سائیکل پر لکشمی چوک آیا کرتے تھے۔ اللہ کی مہربانی سے بی اے کا امتحان دیا تو کامیاب ہو گئے۔ اس سارے عرصے میں میرے بیوی بچے اور بعد ازاں میرے چھوٹے بھائی کے بیوی بچے بھی ہمارے والدین کے پاس گاؤں میں رہے'

وہی ان کی پرورش اور نگہداشت کرتے رہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ہمیں اپنے بیوی بچوں کو لاہور ساتھ رکھنا پڑتا اور ہم پرائیویٹ تعلیم کے لئے وقت نہ نکال سکتے اور اعلیٰ تعلیم سے محروم رہتے۔ لاہور میں رہ کر میں نے بی اے کے بعد سی ٹی' پھر بی ایڈ کے امتحان پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے پاس کر لئے اور پھر پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تعلیم و تحقیق میں داخلہ لے کر ایم ایڈ بھی کر لیا۔ اس دوران چھوٹے بھائی کو وفاقی سیکرٹیریٹ اسلام آباد میں نوکری مل گئی۔ وہاں اس نے ایم اے انگلش کی پرائیویٹ تیاری شروع کر دی اور گارڈن کالج راولپنڈی کے شعبہ انگریزی کے مشہور ٹیچر پروفیسر مل کی اکیڈمی میں داخلہ لے لیا اور اللہ کی مہربانی سے ایم اے انگلش میں کامیابی حاصل کی۔ بعد ازاں پبلک سروس کمیشن پنجاب میں سیکشن آفیسر کا امتحان دیا اور کامیاب ہو کر صوبائی سیکرٹیریٹ لاہور میں سیکشن آفیسر کی پوسٹ پر تعینات ہو گیا[آج کل صوبائی سیکرٹری کے عہدے پر کام کر رہے ہیں]

جب میں نے ایم ایڈ کر لیا تو مجھے سینئر ٹیچر کے طور پر لاہور سے باہر سرسبز و شاداب دیہاتی علاقے میں بھیج دیا گیا' جہاں چند ماہ گزارنے کے بعد میرا تبادلہ گورنمنٹ ہائی سکول شیخوپورہ میں ہو گیا جہاں سے میں نے میٹرک کیا تھا اور میرے اساتذہ بھی اسی سکول میں پڑھا رہے تھے۔ اب میں ان کا colleague بن گیا۔ یہ سارا کچھ اس لئے ہوا کہ والدین کی دعائیں شامل حال رہیں اور انہوں نے میری بیوی بچوں کا ہر طرح کا بوجھ اٹھائے رکھا اور مجھے اطمینان اور سکون فراہم کیا جس کی وجہ سے میں دلجمعی کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے میں لگا رہا۔

تقسیم ہند کے وقت میرے والد صاحب صوبہ بہار میں رانچی کے مقام پر تھے' وہاں وہ آرمی کو یونیفارم مہیا کرتے تھے۔ وہ علاقہ بھارت کے حصہ میں آیا تو وہاں سے پاکستان آنا تھا۔ کچھ لوگ تو پہلے ہی وہاں سے نقل مکانی کر آئے مگر میرے والد صاحب وہیں رہے اور جب آرمی کے وہاں سے شفٹ ہونے کا وقت آیا تو ان کے ساتھ ہی بذریعہ ٹرین وہ بھی لاہور پہنچے اور وہاں سے گوجرانوالہ ہوتے ہوئے اپنے گاؤں جنڈیالہ شیر خان پہنچ گئے۔ اس سفر کے دلدوز حالات وہ بعد ازاں سنایا کرتے تھے اور اسے اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد سمجھتے تھے کہ وہ جان سلامت لے کر بہار سے پنجاب میں اپنے گھر پہنچ گئے۔ جبکہ راستے میں ٹرین پر کئی خونی حملے ہوئے اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوا۔ ٹرین خون آلود تھی۔ راستے میں جگہ جگہ لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ ٹرین آہستہ رفتار سے چلتی تھی اور سفر میں کئی دن لگ گئے۔ گھر پہنچ کر

انہوں نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ جو کچھ وہاں سے کما کر لائے تھے اس کا ایک حصہ غرباء اور مساکین میں تقسیم کر دیا۔ اس تقسیم کا انداز بھی نرالا تھا۔ ایک دن گلیوں میں پھر کر سروے کیا۔ بیواؤں اور ناداروں کے گھر معلوم کئے۔ اگلی رات تاریکی میں گھر سے نکلے۔ باری باری امداد کے مستحق کا دروازہ کھٹکھٹاتے اور اُس کے ہاتھ میں رقم رکھ دیتے اور چل دیتے۔ نہ اپنا تعارف کراتے اور نہ ہی نام بتاتے۔ تقسیم کے بعد جو رقم بچی اس کے ساتھ گاؤں میں ایک دکان کھول کر بیٹھ گئے۔ دکان میں روزمرہ کی اشیاء اور کپڑا بھی تھا۔ دکان کا مال کچھ شیخوپورہ سے خرید کر لے جاتے اور کچھ دوسرا سامان کپڑا وغیرہ خریدنے کے لئے لاہور آتے۔ اس وقت گاؤں سے شیخوپورہ تک پختہ سڑک نہ تھی۔ تانگے چلتے تھے یا پھر سائیکل پر سفر ہوتا تھا۔ شیخوپورہ سے لاہور تک سڑک پختہ تھی لیکن کشادہ نہ تھی۔ بارش کے دنوں میں یہ سڑک بند بھی ہو جایا کرتی تھی۔

میرے والد صاحب کا دکان چلانے کا انداز بھی نرالا تھا۔ گاؤں کا ماحول تھا۔ لوگ غریب تھے۔ مہاجرین تھے تو وہ لٹ پٹ کر آئے تھے۔ میرے والد صاحب کو لوگوں کی کمزوری کا گہرا احساس تھا' چنانچہ وہ معمولی سے معمولی گاہک کو بھی واپس نہ لوٹاتے۔ ایک بابا مہاجر تیل لینے کے لئے دکان پر آیا' ہاتھ سے بوتل گر کر ٹوٹ گئی' اس نقصان پر وہ آنسو بہانے لگا۔ آپ نے اسے اپنے پاس سے بوتل دی اور اُس میں تیل بھی ڈال دیا۔ اس کی حالت زار دیکھ کر اس کی مالی امداد بھی کر دی۔ ہم نے وہ بابا دیکھا' جب تک زندہ رہا دعائیں دیتا رہا اور ممنون رہا۔

کوئی شخص دکان پر آتا اپنی ناداری کا اظہار کرتا اور ادھار مانگتا تو بلا ضمانت اسے ادھار دے دیتے۔ اس طرح ان کی اردگرد کے دیہاتوں میں بھی شہرت ہو گئی۔ چنانچہ ضرورت مند دور دور سے چل کر ادھار خریداری کے لئے آتے۔ والد صاحب کاپی میں ان کا نام' خریدی ہوئی چیز اور رقم درج کر لیتے۔ اُس وقت رواج تھا کہ دکاندار ادھار دیتے تھے' پھر فصل پکنے کے موقع پر وہ لوگوں سے قرض کی رقم وصول کرنے کے لئے ان کے گھروں میں پہنچ جاتے تھے۔ مگر میرے والد صاحب کبھی کسی کے ہاں وصولی کے لئے نہ جاتے بلکہ لوگ خود ہی آ کر دیتے تو لے لیتے۔ اس طرح کئی لوگوں سے ادھار کی رقم واپس نہ ملتی۔ ہم بھائی اور والدہ ان کو کہتے کہ اگر آپ ادھار واپس نہیں لے سکتے تو دیتے ہی کیوں ہیں؟ دیکھیں آپ کی کاپیاں ادھار کے ناموں سے بھری پڑی ہیں۔ یہ ادھار کب وصول ہو گا؟ وہ کہتے جب کوئی ضرورت مند آ کر اپنی غربت کا اظہار کرتا ہے تو میں اُسے انکار نہیں کر سکتا' اللہ تعالیٰ مجھے روزی دے رہا ہے۔ ایک

دن ہم نے ذرا زور دار انداز میں اُن کے اس طرح لوگوں کو ادھار سودا دینے پر اعتراض کیا تو جلال میں آ گئے' ناراض ہوئے اور کہنے لگے کہ تمہارے خیال میں میں اپنا نقصان کرتا ہوں' ٹھیک ہے اپنا ہی نقصان کرتا ہوں' تم میں سے کسی کی کمائی تو ضائع نہیں کرتا' پس تمہیں اس معاملے میں مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں' آئندہ میں ایسی بات سننے کو تیار نہیں۔ اس کے بعد ہم نے انہیں منع نہیں کیا۔ یوں ضرورت مندوں کی مدد کرنا گویا ان کا مشن تھا۔ جب آپ کی رحلت ہوئی تو ادھار والی کاپیاں ہمارے ہاتھ لگیں' ان میں لوگوں کے نام اور ادھار کی رقم لکھی ہوئی تھی۔ ہم نے چاہا کہ ان لوگوں سے رابطہ کر کے ان سے رقم وصول کریں۔ اس سلسلہ میں ابتدا کی اور ایک شخص کو کہا کہ کاپی میں تمہارے نام اتنی رقم لکھی ہوئی ہے' اس کی ادائیگی کر دیجئے۔ اس نے جواب دیا کہ میں نے تو رقم ادا کر دی تھی' وہ میرے نام کے آگے درج رقم کاٹنا بھول گئے ہیں۔ اس پر ہمیں شرمندگی سی ہوئی۔ رات کو والد صاحب مجھے خواب میں ملے۔ خوبصورت سفید لباس پہنے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ میں نے ملاقات کو غنیمت جانتے ہوئے پوچھ لیا کہ ابا جان! ہم نے فلاں شخص سے ادھار کی رقم واپس مانگی جو آپ کی کاپی میں لکھی ہوئی تھی مگر اس نے کہا کہ میں نے تو واپس کر دی ہے۔ یہ کیا معاملہ ہے؟ اس پر والد صاحب نے جواب دیا تمہیں کس نے کہا تھا کہ قرض کی رقم کا تقاضا کرو؟ یہ میرا معاملہ ہے۔ جو تمہیں خود گھر آ کر قرض کی رقم دے دے اس سے لے لو' مگر کسی سے تقاضا نہ کرو۔ میں جانوں میرا کام! چنانچہ اس کے بعد ہم نے کسی سے رقم نہیں مانگی۔ اگر کوئی خود آ کر دے جاتا تو لے لیتے۔

آپ پنج گانہ نماز باقاعدگی سے ادا کرتے۔ نماز کے وقت دکان بند کر دیتے۔ اگر مؤذن یا امام وقت کی پابندی میں کوتاہی کرتے تو ناراض ہوتے اور کہتے کہ جب وقت مقرر ہے تو اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے تاکہ بلاوجہ نمازیوں کو دقت نہ ہو۔ اسی طرح اگر کسی بڑے آدمی کے انتظار میں ایک دو منٹ تاخیر کرتے تو وہ ٹوک دیتے کہ مسجد میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں' بلکہ ''تیرے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے''۔

ایک دفعہ مسجد میں اعلان ہوا کہ میت کو قبرستان میں لے جانے کے لئے چارپائی کی ضرورت ہے۔ دو تین دفعہ کے اعلان پر کسی نے ہامی نہ بھری تو انہوں نے ہاں کر دی۔ چارپائی کا آرڈر دے دیا۔ بنانے والے نے عمدہ قسم کی چارپائی تیار کر دی جس کی قیمت والد صاحب کی استطاعت سے زیادہ تھی۔ تاہم انہوں نے بلاحیل و حجت قیمت ادا کر دی۔ اس کے تھوڑا عرصہ بعد اُن کے انتقال ہو گیا اور اُسی چارپائی پر انہیں قبرستان لے جایا گیا۔

گاؤں میں کسی غریب اور نادار کے کفن کے لئے کپڑا درکار ہوتا تو دے دیتے' رقم کا تقاضا نہ کرتے۔ کوئی دے دیتا تو لے لیتے۔

میرے والد اگرچہ ناخواندہ تھے مگر سلیم الفطرت تھے۔ اچھائی' برائی' صحیح اور غلط میں تمیز کر لیتے تھے۔ دیہاتی ماحول میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے پرورش پائی تھی۔ گاؤں کے جاہلانہ رسم ورواج ان کے سامنے تھے مگر انہوں نے کبھی فضول رسموں کو قبول نہ کیا۔ میں جب بڑا ہوا' دین کا مطالعہ کیا تو جب بھی انہیں قرآن وحدیث کی بات بتائی اس کو انہوں نے اس طرح قبول کیا گویا ان کے دل کی بات ہو۔ غیر اللہ سے مدد مانگنا ان کے نزدیک انتہائی قابل نفرت بات تھی۔ وہ کہتے تھے مخلوق کا ہر فرد اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے' لہٰذا اُسی کی طرف سب کو رجوع کرنا چاہئے۔ اس کے خزانے غیر محدود ہیں' اُس سے مانگنے میں کوئی عار نہیں۔ خاص طور پر اولاد کی خواہش میں مقبروں پر چڑھاوے چڑھانے کو حماقت اور نادانی جانتے۔ اس سلسلہ میں وہ ایک ہندو کا شعر پڑھا کرتے۔

دادو دنیا باوری مڑھیاں پوجن اُوت
جو دنیا تھیں لد گئے اُن تھیں مانگیں پوت!

[دادو شاعر کا نام ہے۔ دیکھو دنیا والے کتنے پاگل اور بیوقوف ہیں کہ قبروں کی پوجا کرتے ہیں اور فوت شدہ لوگوں سے بیٹے مانگتے ہیں۔]

ہم بھائی تعلیم میں اچھے تھے۔ مقامی سکول میں پڑھتے تو کلاس میں اوّل دوم رہتے۔ گاؤں میں لوگ ہماری تعریف کرتے اور ہمارے والد صاحب سے پوچھتے کہ آپ کے بچے پڑھائی میں اتنے لائق کیوں ہیں۔ وہ جواب دیتے کہ میں تو خود اَن پڑھ ہوں' پڑھائی کے سلسلہ میں میں ان کی کوئی راہنمائی نہیں کر سکتا' نہ ہی کسی اور ذریعے سے انہیں کوئی مدد مل سکتی ہے' بس میں تو یہ جانتا ہوں کہ انہیں میں نے رزق حلال کھلایا ہے اور ہمیشہ اس بات کی تلقین کی ہے کہ محنت کرو اور اپنا راستہ خود بناؤ۔ نہ میرے پاس کوئی سفارش ہے اور نہ ہی میں سفارش کو اچھا سمجھتا ہوں۔ میں انہیں کہتا ہوں آنکھیں کھول کر دیکھو گے تو تمہیں چپڑاسی بھی نظر آئیں گے اور آفیسر بھی۔ تم جو بننا چاہو بن جاؤ۔ جتنی محنت کرو گے اتنا پھل پاؤ گے۔

وہ قرآن مجید نہیں پڑھ سکتے تھے' چنانچہ عمر کے آخری سالوں میں مجھ سے سبقاً سبقاً قرآن مجید پڑھا۔ پورا قرآن پڑھ لیا تو بہت خوش ہوئے اور لوگوں میں شیرینی تقسیم کی۔

میرے والد صاحب سلیم الفطرت تھے۔ گناہ اور برائی کے کاموں سے انہیں نفرت تھی۔ کسی کو

بھی بری عادت میں گرفتار دیکھتے تو بڑے حکیمانہ انداز میں اُسے نصیحت کرتے اور سیدھی راہ اختیار کرنے کی ہدایت کرتے۔ محنت کو کامیابی کی کلید جانتے تھے۔ ان کے وجود میں سہل انگاری کا نام ونشان نہ تھا۔ اپنا کام خود کرتے' دوسروں کو کام کہنے سے گریز کرتے۔ سست بندے کو ناپسند کرتے۔ وہ کہتے کہ ہر کام کو محنت اور لگن کے ساتھ خوبصورت انداز میں کرنا چاہئے۔ اگر کوئی جھاڑو بھی دے تو دوسرے لوگوں کے مقابلے میں اچھا دے۔ کوشش کرنا چاہئے کہ اپنے ساتھیوں میں امتیازی پوزیشن حاصل ہو۔ ان کا اپنا حال یہ ہوا کہ جہاں جہاں انہوں نے کام کیا وہاں اپنے ساتھیوں سے آگے آگے رہے۔

خدا ترسی کا مظہر تھے۔ کوئی غریب آدمی ہمیشہ ان کا دوست ہوتا جس کی مشکل میں مدد کرتے تھے۔ ان کے ایک دوست کی بیٹی کی شادی تھی۔ وہ تنگ دست تھا۔ ہماری والدہ کے زیورات میں سے کچھ اس کو دے دیئے' پھر زندگی بھر واپس نہیں لئے۔ ہم کہتے کہ واپس مانگیں۔ وہ جواب دیتے کہ جب اس کے پاس ہوں گے خود ہی دے دے گا' کسی تنگدست کو پریشان کرنا گناہ کی بات ہے۔

ایک غریب کسان ان کا دوست تھا۔ اس کا بیٹا میرا ہم جماعت تھا۔ دوسری یا تیسری جماعت کی بات ہے میں پڑھائی میں اچھا تھا مگر وہ لڑکا انتہائی کند ذہن تھا۔ میرے والد مجھے کہتے کہ اس لڑکے کو ساتھ لے کر چلو' اسے پڑھایا کرو۔ جب میں اس کو سبق یاد کروانے میں ناکام رہتا تو مجھ سے ناراض ہوتے اور سخت سست کہتے۔ ایک دفعہ تو اس کوتاہی پر مجھے تھپڑ بھی رسید کئے۔

میرے والد صاحب بڑے دانا تھے۔ ہمدردی اور غمگساری ان کی طبیعت کا جزو تھی۔ جس کو پریشان دیکھتے اسے صحیح مشورہ دیتے۔ کام چوروں سے انہیں سخت نفرت تھی۔ ایک دفعہ ایک جوان بے روزگار تھا۔ ان کے پاس اٹھتا بیٹھتا تھا۔ ایک دن کہنے لگا مجھے نوکری مل گئی ہے۔ وہ سن کر بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے جاؤ اور ڈٹ کر محنت کرو۔ چند دنوں کے بعد اُس سے ملاقات ہوئی تو پوچھا سناؤ نوکری کیسی چل رہی ہے؟ وہ کہنے لگا میں نے وہ نوکری چھوڑ دی ہے۔ کہنے لگے کیوں؟ اس نے کہا نوکری بہت سخت تھی' گرم بھٹی کے آگے کھڑے ہو کر کام کرنا پڑتا تھا۔ کہنے لگے تم سے پہلے بھی وہاں کوئی کام کرتا تھا؟ کہنے لگا ہاں۔ پھر پوچھا تم چھوڑ آئے ہو تو اب بھی وہاں کوئی کام کرے گا یا نہیں؟ کہنے لگا کرے گا۔ پھر کہا افسوس تم پر کہ وہ کام تمہارے لئے مشکل ہے جو دوسرے بخوبی کر رہے ہیں۔ کوئی کام مشکل نہیں' انسان کا

ارادہ مضبوط اور ہمت جواں ہونی چاہئے۔

وہ کردار و عمل میں بڑے راست رو تھے۔ فضولیات سے نفرت تھی۔ اخلاقی کمزوریوں سے نفور تھے۔ ایک دفعہ دکان میں بیٹھے تھے کہ سامنے سے ایک قلفی بیچنے والا گزرا جو آواز لگا رہا تھا ''کھوئے ملائی والی قلفی''۔ آپ نے اسے پاس بلایا اور بڑے پیار سے پوچھا ''سچی بات بتاؤ تم نے اس قلفی میں کھویا ڈالا ہے؟'' اس نے کہا نہیں۔ پھر پوچھا ملائی ڈالی ہے؟ کہنے لگا نہیں۔ اس پر انہوں نے کہا سارا دن جھوٹ بول رہے ہو جو بڑے گناہ کی بات ہے۔ اس طرح آواز لگاؤ کہ ''ٹھنڈی اور میٹھی قلفی'' اس نے یہ نصیحت قبول کی۔ اس طرح ایک بے خبر کو سیدھی راہ پر ڈال دیا۔

میرے والد صاحب حقّہ بہت پیتے تھے۔ ان کے ہاں اچھے سے اچھا تمبا کو مل جاتا تھا۔ چوبیس گھنٹے ان کا حقّہ تیار ہوتا تھا۔ مگر ہمیں وہ سگریٹ نہ پینے کی ہدایت کرتے تھے۔ ہم نے پوچھا کہ آپ ہمیں تو منع کرتے ہیں مگر خود اتنا زیادہ حقّہ پیتے ہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ میرے ماں باپ بچپن میں فوت ہو گئے تھے' مجھے ماں باپ کی شفقت نصیب نہ ہوئی' میری پرورش مناسب نگرانی میں نہ ہوئی' دیہاتی ماحول تھا' حقّہ پینا عام تھا' لہٰذا مجھے بھی اس کی عادت پڑ گئی' اب اس کی برائی کا گہرا احساس ہے مگر اب یہ عادت پختہ ہو گئی ہے' چھوٹتی نہیں۔ پھر ہمیں کہا کہ تمہارا معاملہ بالکل مختلف ہے' تمہاری پرورش ماں باپ کے زیر سایہ ہو رہی ہے' ہم تمہیں اچھی باتوں کے اختیار کرنے اور بری باتوں سے رکنے کی نصیحت کرتے ہیں اور نگرانی بھی کرتے ہیں' اگر اس کے باوجود تم تمبا کو نوشی کرنے لگو تو پھر میرے اور تمہارے درمیان کیا فرق رہ گیا؟ تمہیں میں اس سے منع کرتا ہوں۔ کتابوں میں تم تمبا کو نوشی کے نقصانات پڑھتے ہو۔ اس سب کچھ کا تقاضا یہ ہے کہ تم ہرگز اس بری عادت کے قریب نہ جاؤ۔ چنانچہ ہم بھائیوں اور بھائیوں کے بچوں میں سے کوئی بھی سگریٹ نہیں پیتا بلکہ ہم سب سگریٹ سے نفرت کرتے ہیں۔ حقّہ ہمارے گھروں میں نہیں ہے۔ اگر کوئی مہمان سگریٹ کا عادی ہمارے ہاں آ جائے تو ہمارے رویئے سے وہ خود اندازہ لگا لیتا ہے کہ یہ لوگ سگریٹ پینے کو پسند نہیں کرتے۔ میرے والد صاحب ہمہ وقت حقّہ پیتے تھے مگر انہوں نے نہ تو کبھی گھر کے کسی فرد کو حقّہ تازہ کرنے کے لئے کہا اور نہ ہی حقّے کے لئے کوئلے سلگانے کو کہا۔ دن اور رات کے اوقات میں وہ خود ہی یہ سارے کام کرتے۔

میرے والد رقیق القلب تھے۔ کسی کو دکھ اور تکلیف میں دیکھ کر پریشان ہو جاتے اور

جہاں تک ہوسکتا اُس کے لئے آسانی پیدا کرنے کی کوششیں کرتے۔ میرے ایک ہی ماموں تھے' ان کے ساتھ حقیقی بھائیوں جیسا سلوک کرتے۔ ایک دفعہ ماموں جان ایک سفر سے پریشان واپس آئے۔ معلوم ہوا کہ دورانِ سفر کسی نے ان کی جیب کاٹ لی ہے اور تمام رقم اڑا لی ہے۔ والد صاحب نے ماموں جان کو بلایا اور ان سے صورت حال دریافت کی۔ ان کو پریشان دیکھا تو مجھے کہا کہ اندر سے میرا بٹوہ لاؤ۔ میں بٹوا لایا تو نقصان کی پوری رقم جو غالباً پانچ سو تھی ان کے حوالے کی۔ انہوں نے لینے سے انکار کیا تو کہنے لگے کہ بھائی کا فرض ہے کہ وہ بھائی کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ انہیں رقم لینے پر آمادہ کرلیا۔

میرے ماموں جان کے ہاں اولاد نہ تھی۔ دوسرا نکاح بھی کیا مگر آرزو پوری نہ ہوئی۔ احساسِ محرومی انہیں ہمہ وقت آزردہ خاطر رکھتا۔ والد صاحب نے میری والدہ سے مشورہ کیا اور فیصلہ کیا کہ اپنا نومولود بیٹا ان کو دے دیں۔ اس فیصلے کا ماموں اور ممانی کو علم ہوا تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ شیر خوار بچہ اپنے گھر لے گئے۔ انتہائی شفقت اور محبت سے اس کی پرورش شروع کر دی۔ ادھر ہماری والدہ کا نومولود بچے کی جدائی میں برا حال تھا۔ اگرچہ انہوں نے بچہ برضا ورغبت دیا تھا لیکن ماں کی ممتا تو فطرت کا تقاضا ہے۔ ازخود گود کو بچے سے خالی کر لینا انتہائی کرب کا باعث تھا۔ اس صورت حال میں والد صاحب انتہائی مضبوط رہے اور والدہ کو تسلی دیتے رہے اور کہتے کہ اس بات کا احساس کرو کہ ہمارے اس اقدام نے تمہارے بھائی اور بھابی کے مرجھائے ہوئے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑا دی ہے۔ کیا ان کو خوشی فراہم کرنا اور ان کا احساس محرومی ختم کرنا ہمارے لئے اطمینان کا باعث نہیں ہے؟ اس سب کچھ کے باوجود تصویر کا دوسرا رخ بھی ان کے سامنے تھا۔ ایک دفعہ کہنے لگے کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ مجھے کہے کہ جب میں نے انہیں اولاد نہ دی تو تم کون ہوتے ہو اولاد دینے والے؟ اس خیال سے ان پر خوفِ خدا کا غلبہ ہوا' رقت طاری ہوئی۔ یہ دیکھ کر میں نے انہیں تسلی دی کہ آپ نے بیٹا اس لئے تو نہیں دیا کہ اللہ نے نہیں دیا تو میں دیتا ہوں۔ آپ نے تو ایک بھائی کی آزردگی دور کرنے کے لئے بہت بڑی قربانی دی ہے۔ یہ تو ایسے ہی ہے کہ ایک بھوک سے نڈھال شخص کو کوئی اپنے کھانے میں شریک کر کے اس کی بھوک مٹا دے اگرچہ خود اس کی اشتہا باقی ہو۔ اس پر وہ قدرے مطمئن ہوگئے۔

میرے والد صاحب سادگی پسند تھے۔ سادہ لباس پہنتے۔ سادہ خوراک انہیں پسند تھی۔ اپنے بیٹے بیٹیوں کی شادیاں انتہائی سادہ انداز میں منعقد کیں۔ ان کو اس بات سے ذرا عار نہ

تھی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ان کا مقولہ تھا کہ ہمیشہ اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلاؤ۔ان کا اندازِ زیست ''مَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ'' [میانہ روی اختیار کی وہ محتاج نہ ہوا] کا مصداق تھا۔یہی وجہ ہے کہ وہ مالدار نہ تھے مگر لوگ انہیں مالدار سمجھتے تھے۔

عزیز و اقارب اور برادری میں کوئی شخص فوت ہو جاتا تو جنازے میں شرکت کرتے۔ اگر گاؤں سے باہر کہیں ایسا واقعہ پیش آتا تو بس تعزیت کے لئے ایک ہی دفعہ جاتے۔بار بار کے جانے کو پسند نہ کرتے' بلکہ لوگوں کو بھی تلقین کرتے کہ وہ رسم و رواج کی خاطر فوتگی والے گھر بار بار نہ جائیں۔

میرے والد صاحب مشقت کے عادی اور عزم و ہمت کا پیکر تھے۔زندگی میں ایک دَور ایسا بھی آیا کہ انہیں شیخوپورہ شہر میں دکان کرنا پڑی۔شیخوپورہ سے گاؤں جنڈیالہ شیر خان کا فاصلہ ۹ میل (چودہ کلومیٹر) ہے۔اُس وقت کچی سڑک تھی جس پر تانگے چلتے تھے۔تانگے سے یہ فاصلہ دو گھنٹے میں طے ہوتا تھا [اب یہ سڑک پختہ ہو چکی ہے] والد صاحب کئی سال یہ دکان چلاتے رہے اور روزانہ کا معمول یہ تھا کہ صبح فجر کی نماز پڑھ کر پیدل چل پڑتے۔شہر پہنچ کر دکان کھولتے۔سارا دن کام کرتے۔مغرب کی نماز شہر میں پڑھ کر واپس پیدل چل پڑتے۔ گاؤں پہنچ کر عشاء کی نماز پڑھتے۔رات آرام کرتے اور صبح پھر بعد از نماز فجر شہر کے لئے چل پڑتے۔اُن کا یہ معمول کئی سال تک رہا۔پیدل چلنا صحت کے لئے بہت مفید بتاتے ہیں۔ میرے والد صاحب کی صحت اچھی رہی۔جسم دبلا پتلا تھا۔دانت اخیر تک صحیح سالم رہے۔ بڑھاپے میں بھی نوجوانوں کی طرح دانتوں سے گنا چھیلتے اور چوستے تھے۔آخری عمر میں البتہ کھانسی شدت اختیار کر گئی۔اس کھانسی نے ان کو بے بس کر دیا۔معلوم ہوتا ہے اس کھانسی کی وجہ وہی حقّہ نوشی تھی جس نے ان کے پھیپھڑوں کو شدید متاثر کر دیا تھا۔اسی بیماری میں وہ ۷۲ سال کی عمر میں ۱۹۷۴ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ہم نے اُن کی جوانمردی' سخت کوشی اور مضبوط عزم و استقلال سے بہت کچھ سیکھا۔اللھم اغفر لہ وارحمہ

جدید دنیائے اسلام

قسط وار سلسلہ (15)

برونائی دارالسلام

تحقیق وتحریر: سید قاسم محمود

برونائی : ایک نظر میں

سلطان : حاجی حسن البلقیہ (1967ء سے اب تک)
رقبہ:2,228 مربع کلومیٹر (5770 مربع میل)
آبادی: تین لاکھ اٹھاون ہزار (2003ء میں)
شرح افزائش آبادی:1.6 فیصد
شرح پیدائش:19.7 فی ہزار
شرح اموات اطفال:13.5 فی ہزار
گنجانی آبادی:161 فی مربع میل
دارالحکومت: بندرسری بگوان (آبادی 78 ہزار)
کرنسی: برونائی ڈالر
زبانیں: ملائے، چینی، انگریزی
نسلیں: ملائے، چینی اور دیگر
مذاہب : مسلمان 86 فیصد، بدھ 12 فیصد، عیسائی 9 فیصد
شرح خواندگی:88 فیصد
مجموعی قومی پیداوار:6.2 ارب ڈالر (2003ء)
فی کس آمدنی:18 ہزار ڈالر سالانہ
شرح افزائش:3 فیصد
افراطِ زر:ایک فیصد
بے روزگاری:10 فیصد
قابل کاشت رقبہ:3 فیصد
زراعت: چاول، سبزیاں، پھل، چکن اور آبی بھینس
صنعت : پٹرولیم، تیل کی صفائی، مائع گیس، تعمیراتی کام
قدرتی وسائل: پٹرولیم، قدرتی گیس، عمارتی لکڑی
برآمدات: تین ارب ڈالر (2003ء) خام تیل، مائع قدرتی گیس، پٹرولیم کی مصنوعات
درآمدات: 4 . 1 ارب ڈالر ۔ مشینری، ٹرانسپورٹ کا سامان، اشیائے مصنوعہ، اشیائے خوردنی، کیمیاوی اشیاء
تجارتی ساتھی: جاپان، امریکا، جنوبی کوریا، تھائی لینڈ، سنگاپور، برطانیہ، ملائشیا

برونائی/برونئی

برونئی کو دولت وثروت کی فراوانی کی وجہ سے جنوب مشرقی ایشیا کا کویت کہا جاتا ہے۔ یہ چھوٹی سی اسلامی سلطنت انڈونیشیا کے جزیرہ بورنیو کے شمال مغربی ساحل پر، اور جزیرہ کالی منتان کے شمال مشرق میں ملائشیا کی ریاستوں صباح اور ساراوک کے درمیان واقع ہے۔ یہ سلطنت مشرق سے شمال مغرب کی طرف 71 میل لمبی اور شمال سے جنوب مغرب تک 56 میل چوڑی ہے۔ اس کے شمال میں بحیرۂ جنوبی چین واقع ہے۔ باقی تین اطراف سے ملائشیا کے مشرقی صوبے ساراوک نے اسے گھیر رکھا ہے۔ صوبہ ساراوک کی ایک پٹی اسے درمیان سے اس طرح کاٹتی ہوئی گزرتی ہے کہ برونئی دو

حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ مغربی حصہ کچھ بڑا ہے۔ برونئی کا ساحل 100 میل لمبا ہے۔

صدیوں پہلے یہاں مختلف ملکوں اور علاقوں سے تعلق رکھنے والے تاجر اور سوداگر تجارت کی غرض سے آیا کرتے تھے۔ چھٹی صدی عیسوی میں برونئی اور چین کے درمیان تجارت ہوتی تھی۔ تیرہویں صدی میں برونئی جاوا کی ہندو سلطنت کے زیر اقتدار آ گیا اور پندرہویں صدی تک جاوا کے ماتحت رہا۔ تیرہویں صدی میں جاوا کی سلطنت کو زوال آ گیا اور عرب سے مسلمان تاجروں نے برونئی کا رخ کیا۔ ان مسلمان تاجروں کی بدولت یہاں اسلام پھیلا۔

برونئی کے ایک ہندو راجا نے 828 ہجری/1425ء میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ وہ 1425ء میں سلطان محمد شاہ سے ملاقات کے لئے ملاکا گیا تو وہاں اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گیا۔ اس کے عہد میں ایک بزرگ مبلغ سلطان برکت برونئی آئے اور انہوں نے یہاں اسلام کی تبلیغ کی۔ سلطان برکت نے یہاں پہلی مسجد تعمیر کرائی اور اسلامی قوانین نافذ کرائے۔ اُس وقت سے آج تک برونئی ایک مسلم سلطنت کے طور پر قائم و دائم ہے۔

سولہویں صدی کے آغاز تک سلطنت برونئی کافی پھیل چکی تھی۔ شاہ بولقیہ پنجم کے زمانے میں بورنیو، جزائر سولو اور فلپائن اس سلطنت کا حصہ تھے۔ منیلا کا شہر بھی اسلامی پرچم تلے تسخیر ہو چکا تھا۔ سولہویں صدی میں پرتگالیوں اور ولندیزیوں کی آمد سے ایک نئی کشمکش شروع ہوئی۔ 1521ء میں پرتگالی فرڈی ننڈ نے سب سے پہلے اپنا بحری جہاز بورنیو کے ساحل پر لنگر انداز کیا۔ اُس وقت اس ملک کے حکمرانوں کے زیر نگیں جنوبی فلپائن اور بورنیو کا زیادہ تر ساحلی علاقہ تھا۔

سولہویں صدی میں برونئی پر ولندیزیوں نے قبضہ کیا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں یہ سلطنت موجودہ برونئی اور شمالی بورنیو تک محدود ہو کر رہ گئی۔ یورپی سیاحوں، مہم جویوں، تاجروں اور طالع آزماؤں نے ادھر کا رخ کیا۔ انگریز تاجروں کی آمد سے بورنیو میں جھگڑے، فساد اور افراتفری کا دور شروع ہوا۔ یہ مسلح اور دہشت گرد تھے۔ ایک انگریز مہم جو اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے سابق ملازم جیمز بروک نے اس بغاوت کو کچل دیا۔

سلطان نے ایک معاہدے کے ذریعے اسے ساراوک کا راجہ بنا دیا۔ بروک فیملی رفتہ رفتہ پاؤں پھیلانے لگی۔ 1861ء تک دریائے راجانگ کا علاقہ ان کے کنٹرول میں آ گیا۔ 1888ء میں برطانیہ نے ساراوک کا کنٹرول سنبھال لیا، اگرچہ خاندان بروک اندرونی معاملات میں خود مختار رہا۔ 1890ء تک سلطان برونئی ایک چھوٹے سے علاقے کے سوا تمام سلطنت سے محروم ہو چکا تھا۔

1905ء میں حکومتِ برطانیہ نے برونئی کو باقاعدہ اپنی قلمرو میں شامل کر لیا اور یہاں اپنا ایک ریذیڈنٹ مقرر کیا۔ سلطان کی حیثیت محض آئینی حکمران کی سی ہو کر رہ گئی۔

1929ء۔ یہاں پہلی بار تیل کے بڑے ذخائر دریافت ہوئے۔

1943ء۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں جاپانیوں نے برونئی پر قبضہ کرلیا' جسے 1945ء میں آسٹریلیا نے واگزار کرایا۔

1945ء۔ جنگ عظیم کے بعد برونئی کی تاریخ میں اوپر تلے چند اہم سیاسی واقعات رونما ہوئے۔ بروک خاندان کے گورے راجا نے ساراوک کو تاج برطانیہ کی تحویل میں دے دیا۔ موجودہ سلطان کے والد سر عمر علی سیف الدین تخت نشین ہوئے۔ وہ اندرونی معاملات میں خودمختار تھے۔ دفاع اور خارجہ امور کی ذمہ داری برطانیہ کی رہی۔

1959ء میں برونئی کا نیا آئین بنا' جس کے تحت ایک مجلس وزراء قائم کی گئی جس کا صدر سلطان ہے۔ برونئی دراصل مَیلے نسل کے مسلمان باشندوں کی ریاست ہے' اس لئے جب تمام مَیلے (یا ملاوی) علاقوں کا ملائشیا کے نام سے ایک وفاق بنانے کی تحریک شروع ہوئی تو برونئی کے باشندوں نے برطانیہ سے آزادی حاصل کر کے وفاقِ ملائشیا میں شامل ہونا چاہا۔ اس قومی تحریک کے قائد برونئی کی پیپلز پارٹی کے رہنما اے ایم ازہری تھے۔ سلطان برونئی برطانیہ کے زیرسایہ اپنا اقتدار برقرار رکھنا چاہتے تھے' اس لئے یہ تحریک کامیاب نہ ہوسکی اور دسمبر 1962ء میں جب ازہری کی قیادت میں مَیلے باشندوں نے بغاوت کردی تو اس کو سختی سے کچل دیا گیا۔ ازہری کو ملایا میں سیاسی پناہ لینا پڑی۔ ان کی پیپلز پارٹی کو خلافِ قانون قرار دے دیا گیا۔ 16 ستمبر 1963ء کو ملائشیا کا وفاق قائم ہوا تو سلطان نے اس میں شرکت سے انکار کردیا۔

1967ء میں نمائندہ حکومت کے لئے برطانوی دباؤ کے تحت سلطان وقت سر عمر علی سیف الرحمٰن تاج وتخت سے دستبردار ہوگئے اور اُن کی جگہ ان کے بیٹے سر مودا حسن البلقیہ معزالدین والدولۃ سلطان ہوئے۔ اس وقت سے وہی برونئی کے حکمران ہیں۔ 1970ء میں نئے سلطان نے مجلسِ قانون ساز کو توڑ دیا اور اس کی جگہ اسمبلی کے ارکان کو خود نامزد کیا۔

نومبر 1971ء میں برطانیہ اور برونئی میں نیا معاہدہ ہوا جس کے تحت برونئی کو مکمل طور پر اندرونی خودمختاری مل گئی۔ برونئی کی دفاعی کونسل میں برطانیہ کو نمائندگی حاصل ہے اور برطانوی فوج کی ایک گورکھا بٹالین برونئی میں تعینات ہے۔ برونئی کی کُل فوج تین ہزار چار سو سپاہ پر مشتمل ہے' جن میں سے 450 نیوی اور 200 افراد ایئرفورس سے وابستہ ہیں۔ دو ہزار نوجوان پولیس میں ہیں۔

سلطان برونئی کو ایک مدت تک اس بات کا ڈر رہا کہ ملائشیا کی حکومت ان چھاپہ ماروں کی مدد سے جو وفاقِ ملائشیا کے حامی ہیں' سلطان کی حکومت کا تختہ نہ پلٹ دیں۔ اس کے علاوہ فلپائن بھی برونئی پر اپنے حق کا دعوے دار تھا۔ یہ تمام خطرے برونئی کی مکمل آزادی کی راہ میں رکاوٹ رہے ہیں اور ان رکاوٹوں ہی کی وجہ سے سلطان نے برطانوی فوجی امداد کا سہارا لیا ہے۔ اس لئے برونئی میں برطانوی فوج کی ایک گورکھا رجمنٹ مستقل طور پر متعین ہے۔

30/جون 1978ء کو لندن میں مذاکرات کے بعد یہ اعلان کیا گیا کہ برونئی کو 1983ء میں مکمل آزادی مل جائے گی۔ انڈونیشیا اور ملائشیا نے بھی برونئی کی آزادی اور سلامتی کے تحفظ کا یقین دلایا ہے۔ ان دونوں پڑوسی ممالک کی طرف سے آزادی کے تحفظ کی یقین دہانی کرانے کے علاوہ فلپائن بھی برونئی پر اپنے دعوے سے دست بردار ہو گیا ہے۔ ان تمام خطرات و خدشات کے دور ہو جانے کے بعد 1984ء میں برونئی کو برطانیہ سے مکمل آزادی حاصل ہو گئی۔

1985ء میں حکومت نے ایک سیاسی جماعت ''برونئی قومی جمہوری پارٹی'' (بی این ڈی پی) بنانے کی اجازت دے دی۔ اس کے نصف سے زائد ارکان سرکاری ملازم تھے۔ حکومت نے بعد میں سرکاری ملازمین کی شمولیت پر پابندی لگائی تو اس پارٹی کے ارکان کی تعداد خاصی کم ہو گئی۔ جنوری 1988ء میں سلطان نے ایمرجنسی (ہنگامی حالت) نافذ کر کے یہ پارٹی ختم کر دی اور اس کے صدر اور نائب صدر کو گرفتار کر لیا گیا۔

برونئی کا رقبہ مختصر لیکن زمین زرخیز ہے۔ 80 فیصد رقبے پر جنگلات ہیں۔ ان جنگلات میں استوائی سدا بہار درختوں کی کثرت ہے۔ ربڑ، سال، ساگوان، سنکونا، بانس، آبنوس اور عمارتی لکڑی کے درخت قابل ذکر ہیں۔ بارش کی کثرت کی وجہ سے 80 فیصد رقبہ جنگلات سے ڈھکا ہوا ہے اور صرف تین فی صد رقبہ زیر کاشت ہے جس پر چاول کی کاشت ہوتی ہے۔ ربڑ یہاں کی قیمتی پیداوار ہے جو برآمد کی جاتی ہے، لیکن برونئی کی خوشحالی کی بنیاد پٹرول اور قدرتی گیس ہے۔ پٹرول اگرچہ 1920ء میں دریافت ہو گیا تھا، لیکن اس کی پیداوار میں گزشتہ چند برسوں میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ اور اس وقت برونئی جنوبی ایشیا میں انڈونیشیا کے بعد پٹرول پیدا کرنے والا دوسرا بڑا ملک بن گیا ہے۔

برونئی کو بجا طور پر مشرق بعید کا کویت کہا جا سکتا ہے۔ تیل سے ہونے والی یہ آمدنی تعمیر و ترقی کے کاموں پر صرف کی جا رہی ہے۔ برونئی دنیا کی پہلی مملکت ہے جہاں قدرتی گیس کو مائع میں تبدیل کرنے کا کارخانہ قائم ہے۔ یہ کارخانہ لوموت کے مقام پر قائم کیا گیا ہے اور دنیا میں سب سے بڑا کارخانہ ہے۔

برونئی کا دارالحکومت بندرسری بگوان ہے۔ 1970ء تک یہ ''برونئی ٹاؤن'' کے نام سے معروف تھا۔ یہ شہر دریائے سنگائی کے دہانے پر واقع ہے۔ یہاں ایک بندرگاہ ہے جس کی وجہ سے تجارت خوب ہوتی ہے۔ یہاں کا بین الاقوامی ہوائی اڈہ دنیا کے خوبصورت ترین ہوائی اڈوں میں شمار ہوتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں یہ شہر تقریباً تباہ ہو گیا تھا۔ اب اسے دوبارہ بسایا گیا ہے۔ یہاں کا شاہی محل اور سپورٹس اسٹیڈیم بہت مشہور ہیں۔ مسجد سلطان عمر علی سیف الدین مشرق بعید کی ایک خوبصورت اور سب سے بڑی مسجد ہے۔

موجودہ سلطان شاہ حسن البلقیہ برونئی کے انتیسویں حکمران ہیں۔ سینڈھرسٹ ملٹری اکیڈمی

کے گریجویٹ ہیں۔ سال میں تین دن دربار لگاتے ہیں اور لوگوں کی شکایات خود سنتے ہیں۔ ان کی دو بیویاں ہیں۔ دوسری بیوی رائل برونئی ایئر لائنز کی ایک سابق ایئر ہوسٹس ہیں۔

سلطان البلقیہ دنیا کی امیر ترین شخصیت ہیں۔ ان کی دولت کا اندازہ 25 ارب ڈالر (امریکی) ہے۔ وہ ڈھائی سو ملین ڈالر کی لاگت سے تیار کردہ ایک عالیشان محل ''آستانہ نورالایمان'' میں رہتے ہیں۔ اس محل کے 778 کمرے ہیں۔ محل کی تعمیر میں 38 اقسام کا سنگ مرمر استعمال ہوا ہے۔ محل کی چھتوں میں 564 فانوس ہیں۔ بارہ فانوس صرف دربار ہال میں ہیں۔ شاہی مہمان خانے میں چار ہزار افراد بیک وقت بیٹھ سکتے ہیں۔ محل کی محرابوں پر خالص سونے کی ٹائلیں لگی ہوئی ہیں۔ ''آستانہ نورالایمان'' دنیا کا سب سے بڑا محل ہے۔ بکنگھم پیلس اور ویٹی کن بھی شان و شوکت میں اس سے بہت کم ہیں۔

دنیائے اسلام کا یہ امیر ترین، مگر رقبے اور آبادی کے لحاظ سے سب سے چھوٹا ملک برونئی دار السلام اسلامی سربراہ کانفرنس کی تنظیم (او آئی سی) اور اقوام متحدہ کا باضابطہ رکن ہے۔

بقیہ : تہذیب کا زہر

تہذیبیں اپنی روحانی نشاۃِ ثانیہ کے بعد ہی معراج کو پہنچی تھیں۔ نیز نوع انسان کی تاریخ میں وہی ادوار شاندار رہے ہیں جن میں اعلیٰ نصب العین کے حصول کا جذبہ کارفرما تھا۔ لہٰذا اب جبکہ دنیا کا ایک مرکز پر آنا امر لازم بن چکا ہے اور ایک نئی تخلیق ہونے کو ہے، دنیا کی تمام اقوام کو چاہئے کہ وہ صلح صفائی اور باہمی رضامندی کے ساتھ عروجِ آدم کے لئے آزمائے جانے والے فرسودہ نظریات کے بجائے اس نسخۂ کیمیا کی جانب بھی توجہ کریں جس نے رنگ، نسل اور جنس کی تفریق سے بالاتر ہو کر ہمیشہ نوعِ انسانی کو ''یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ'' کہہ کر مخاطب کیا ہے۔

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش — اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہو گی ترنم آفریں بادِ بہار — نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل — موجِ مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی!
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود — پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں — محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!

(اقبال: ''شمع''، بانگ درا)